تحریکِ آزادی اردو نثر

اور مسلم ادبار

(۱۸۵۷ تا ۱۹۴۷)

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی

راجستھان وقف بورڈ جے پور (راجستھان)

تحریکِ آزادی اُردو نثر

اور مُسلم اُدبا

(۱۸۵۷ تا ۱۹۴۷)

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی

HaSnain Sialvi

راجستھان وقف بورڈ جے پور (راجستھان)

نام کتاب ــــــــــ تحریکِ آزادی، اُردو نثر اور مسلم اُدبار

مصنف ــــــــــ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی

سن اشاعت ــــــــــ ۱۹۹۷ء

خوش نویس ــــــــــ محمد سفیان نعمانی، جے پور

مطبع ــــــــــ کلر پرنٹنگ پریس، دہلی

ناشر

راجستھان وقف بورڈ، جے پور (راجستھان)

TEHRIK E AZADI, URDU NASR

AUR MUSLIM UDEBA

(To Commemorate the 50th year of India's independence)

BY

DR. ZIA UR REHMAN SIDDIQUI
M.A. Ph.D
Lecturer, Urdu Teaching and Research Centre Govt. of India
Solan - H.P.

Published by :
RAJASTHAN WAQF BOARD, JAIPUR

انتساب

محترم احترام اللہ صاحب کی نذر!
جن کی شخصیت اس کتاب کی اشاعت کے
لئے محرکِ اوّل ثابت ہوئی۔

اظہارِ تشکر

محترم شوکت انصاری صاحب چیرمین راجستھان وقف بورڈ، جے پور کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فریضہ تصور کرتا ہوں جنہوں نے ہندوستان کی آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر راجستھان وقف بورڈ کی جانب سے کتاب کو شائع کرنے کی اجازت دی نیز اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود مفید مشوروں سے نوازا۔ انہیں کی رہنمائی اور سرکردگی میں یہ دشوار گذار کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

جناب احترام اللہ صاحب سیکریٹری راجستھان وقف بورڈ کا صمیمِ قلب سے مشکور ہوں جنہوں نے اپنی علمی و منصبی مصروفیتوں کے باوجود کتاب کی اشاعت کے ہر مرحلے کی تکمیل میں بڑی دلچسپی کے ساتھ اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔ زیرِ نظر کتاب کی اشاعت دراصل انہیں کی شفقتوں کا نتیجہ ہے۔

راجستھان وقف بورڈ کے تمام کارکنان کا ممنون ہوں جنہوں نے اشاعت کے سلسلے میں ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں۔

ضیاء الرحمٰن صدیقی

کتب کو بِنا کسی مالی فائدے
کے (مفت) پی ڈی ایف کی
شکل میں تبدیل کیا جاتا ہے

حسنین سیالوی
0305-6406067

HaSnain Sialvi

ترتیب

حرفِ اوّل

۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد ہمارا ملک پوری طرح برطانوی سامراج کے شکنجے میں آگیا۔ غیر ملکی نوآبادیاتی حکومت نے معاشی استحصال کے علاوہ بھی ہندوستانیوں کی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا تھا۔
مغربی تہذیب کے سیلاب میں ہندوستانیوں کی صدیوں سے پرورش یافتہ تہذیبی، سماجی اور اخلاقی قدریں بھی خس وخاشاک کی طرح بہہ گئیں اور پوری ایک صدی قدیم وجدید کی کشمکش میں گذری جس کا انجام مغربی صنعتی تہذیب کے غلبہ واقتدار کی شکل میں رونما ہوا۔

انگریزوں نے اپنے نوآبادیاتی نظام کو مستحکم کرنے کے لئے جن تصورات کو فروغ دیا ان میں قومیت کا شعور بھی تھا، جو ہندوستان کے حق میں آزادی کی نعمت کا مقدمہ ثابت ہوا۔ ہندوستان میں قومی شعور کی بیداری کے ساتھ جنگِ آزادی میں تیزی اور ہمہ گیری پیدا ہوگئی اور ہندوستانیوں نے انگریزوں کو اپنے ملک سے باہر نکالنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

تحریکِ آزادی کے فروغ اور قومی شعور کی بیداری میں اُردو زبان وادب نے عموماً اور اُردو نثر نے خصوصاً ایک اہم اور موثر کردار ادا کیا اور آزادی کی تحریکات میں ایک نئی روح پھونکی۔

زیرِ نظر کتاب "تحریکِ آزادی اور اُردو نثر" ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عرصہ پر پھیلی ہوئی ہے جو آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب تحریکِ آزادی کے تاریخی اور سیاسی پس منظر پر محیط ہے۔ اس باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ انگریز ہندوستان میں کس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں داخل ہوئے اور انہوں نے کس طرح ملکہ الزبتھ کی مدد سے ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں قائم کرکے مستحکم بنایا۔ ۱۷۵۷ء میں بنگال کے نواب سراج الدولہ اور کلائیو کے مابین پلاسی کے میدان میں زبردست معرکہ ہوا۔ انگریزوں

کے فریب کارانہ رویّے نیز نواب کے سپہ سالار کی سازش سے سراج الدولہ کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ اس طرح بنگال پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔

زیرِ نظر باب میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے اسباب و علل سے بحث کرتے ہوئے ان محرکات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو انگریزوں سے ہندوستانی عوام اور سپاہ کی نفرت کا باعث بنے اور بالآخر انہوں نے انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اِس خونیں انقلاب کی تفصیلات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس باب میں اس کے نتائج و اثرات بھی وضاحت کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

ہندوستانیوں اور خصوصًا مسلمانوں پر انگریزوں کے نو بہ نو مظالم کی داستان بیان کی گئی ہے نیز ان مظالم کے خلاف ہندوستانیوں کے ردعمل کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ غرضکہ ان تمام عوامل پر روشنی ڈالی گئی ہے جو ہندوستانیوں کے دلوں میں تحریکِ آزادی کا بیج بونے اور اس کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوئے۔

باب دوم میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام (۱۸۸۵ء) سے آزادیِ ہند (۱۹۴۷ء) تک جدوجہد آزادی کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں انڈین نیشنل کانگریس کے بعض اہم اجلاسوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو ہندوستان کے بڑے شہروں میں منعقد ہوئے۔ اسی باب میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کیوں قائم ہوئی۔ ابتدا میں اس انجمن کے اغراض و مقاصد کیا تھے اور آگے چل کر اس نے کیا صورت اختیار کی۔ اسی کے ساتھ اس باب میں ان تمام تحریکات اور حالات و واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو جدوجہد آزادی کے سلسلے میں عمل پذیر ہوئے اور جن کے نتیجے کے طور پر ہندوستانی عوام کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔

تحریک آزادی کے اس تاریخی، سیاسی پس منظر کے بیان کے بعد تیسرے باب سے کتاب کا اصل حصہ یعنی اُردو نثر کی روشنی میں تحریکِ آزادی کا مطالعہ شروع ہوتا ہے۔ اس حصے میں نثر کی مختلف اصناف و اقسام میں تحریک آزادی کے نقوش تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس عظیم تحریک کے فروغ میں مختلف اصناف نیز مسلمانوں کا بالواسطہ یا بلاواسطہ جو بھی

حصّہ رہا ہے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرا باب اُردو ناول سے متعلق ہے۔ اس باب میں ڈپٹی نذیر احمد سے لیکر آزادیِ ہند تک اُن ناول نگاروں کی کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر تحریکِ آزادی کے فروغ کی مساعی یا جدوجہد آزادی کے آثار نظر آتے ہیں اس سلسلے میں بالخصوص پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، سجّاد ظہیر، عزیز احمد، وغیرہ کے ناولوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

باب چہارم میں تحریک آزادی کا مطالعہ اردو افسانوں کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ اس باب میں پریم چند کی گاندھی جی سے عقیدت اور تحریک آزادی سے ذہنی و عملی وابستگی نیز اپنے افسانوں کے ذریعے اس کے اظہار کی بدولت خصوصی مطالعہ کے مستحق قرار پائے ہیں۔ پریم چند کے علاوہ اس خصوص میں جن افسانہ نگاروں کی تخلیقات زیرِ بحث آئی ہیں ان میں کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، احمد علی شامل ہیں۔ متعلقہ افسانہ نگاروں کی نگارشات کا جائزہ لیکر یہ حقیقت آشکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ افسانہ نے اپنے محدود کینوس کے باوجود آزادی سے متعلق جذبات و احساسات کو اپنے اندر سمونے میں کوتاہ بینی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

پانچواں باب ڈرامہ سے متعلق ہے۔ موضوع کی مناسبت سے اس باب میں صرف انہیں ڈراموں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جو خالصتاً سیاسی تھے اور جن میں کسی بھی عنوان سے تحریکِ آزادی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں یا اس سے وابستگی اور اسے فروغ دینے کی کوششوں کا سُراغ ملتا ہے۔ اس طرح کے ڈراموں میں فرنگی اور ہندوستانی طرز حکومت، نانا صاحب، اُمراؤ علی کا ڈرامہ "البرٹ بل"، مولانا ظفر علی خاں صاحب کا ڈرامہ "جنگ روس وجاپان"، اصغر علی نظامی کا ڈرامہ "قومی دلبر"، عبد اللطیف شاہ کا ڈرامہ "ہمارا گھر"، محشر انبالوی کا ڈرامہ "غریب ہندوستان"، ریاض دہلوی کا ڈرامہ "مسلم پجاری"، نیتر انبالوی کا "وطن"، دل لکھنوی کا "تاج محل"، اور شہیدِ وطنؒ شمس لکھنوی کے ڈرامے "مادرِ وطن" اور "حبُّ الوطن"، محمد دین تاثیر کا ڈرامہ "لیلائے وطن"، عاجز ناگپوری کا "پیامِ حق"، محی الدین عزم کا ڈرامہ "دیس

کی پکار"۔ اظہر دہلوی کا ڈرامہ "بیداری"۔ محمد مجیب کا ڈرامہ "آزمائش" شامل ہیں۔

باب ششم میں طنز و مزاح کے تعلق سے تحریکِ آزادی کے تخلیقی اظہار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ طنز و مزاح کے پس منظر اور آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے منشی سجاد حسین کے مضامین اور سیاسی نظریات سے بحث کی گئی ہے۔ نیز "اودھ پنچ" کے قلم کاروں کی تخلیقات اور دیگر تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بعض ایسے مضامین سے بحث کی گئی ہے جن میں مزاح کے پیرائے میں حکومتِ وقت کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں سجاد حسین کے بعض اہم طنزیہ و مزاحیہ خطوط زیرِ بحث آئے ہیں جو انہوں نے اس دور کے سیاسی تناظر میں حکام کو تحریر کیے تھے۔

"اودھ پنچ" کے بعد سے آزادیِ ہند تک جن اہلِ قلم کے یہاں خالصتاً یا ضمناً طنز و مزاح کے پیرائے میں تحریکِ آزادی سے متعلق اظہارِ خیال ملتا ہے۔ اس باب میں ان سب کی متعلقہ تحریروں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب ہفتم میں خود نوشت سوانح اور سوانح عمری میں تحریکِ آزادی کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ باب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ خود نوشت سوانح عمریوں سے متعلق ہے، دوسرے حصہ میں سوانح عمریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب میں صرف انھیں سوانح عمریوں اور خود نوشت سوانح کا جائزہ لیا گیا ہے جو سیاسی نوعیت کی ہیں اور جن سے بالواسطہ یا براہ راست تحریکِ آزادی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

موضوع کی مناسبت سے اس باب میں جن خود نوشت سوانح عمریوں کو شامل کیا گیا ان میں جعفر تھانیسری کی "تواریخ عجیب" ظہیر دہلوی کی "داستانِ غدر" سید رضا علی کی "اعمال نامہ" افضل حق چودھری کی "میرا افسانہ" نواب احمد سعید خاں چھتاری کی "یادِ ایام" عبدالمجید سالک کی "سرگذشت" عبداللطیف بٹالوی کی "لطیف کی کہانی" وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جہاں تک سوانح عمریوں کا تعلق ہے تو ان میں سے بعض اہم سوانح عمریوں سے تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور بعض کی صرف نشاندہی کرادی گئی ہے۔

باب ہشتم اردو صحافت پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء سے آزادیِ ہند تک کے ان

اخبارات اور رسائل سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے جن کا مطمح نظر خالصتاً سیاسی تھا۔ یہ باب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا باب ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک کی صحافت کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں بیسویں صدی کے اوائل سے حصولِ آزادیِ ہند تک کے اخبارات اور رسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان رسالوں اور اخبارات کے مُدیروں نے براہ راست برطانوی حکومت کی ناانصافیوں اور مظالم کے خلاف لکھا اور اپنی تحریروں کے ذریعے عوام میں آزادی کا جذبہ اور قومی شعور پیدا کیا۔ اور اس طرح آزادی کی مختلف تحریکات کو عوام تک پہنچانے میں ایک اہم اور موثر کردار ادا کیا۔ جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ان اردو رسائل و اخبارات کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کے مدیروں کو طرح طرح کی سخت سزائیں سہنے کے باوجود آخر تک اپنے وطن عزیز اور اس کے متعین نصب العین کی خاطر بیباک اور نڈر ہو کر لکھتے رہے۔

اس وسیع موضوع پر بکھرے اور پھیلے ہوئے کام کو ایک مقالے میں جس کی بہر حال کچھ حدود ہوتی ہیں سمیٹنا آسان کام نہیں تھا۔ پھر بھی خاکسار نے کوشش کی ہے کہ موضوع سے متعلق تمام ضروری مواد اور مطالعے کی مختلف جہات کو اختصار کے ساتھ اس طرح پیش کر دیا جائے کہ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ مجھے امید ہے کہ اس سے تحریک آزادی اور اردو نثر کے تعلق کو سمجھنے نیز مسلم مجاہدین کے کارناموں کو جاننے میں مدد ملے گی۔

کتاب کی تیاری کے سلسلے میں مختلف مقاصد کے پیشِ نظر جن کتب خانوں سے استفادہ کرنیکا موقع ملا ان میں مادر درسگاہ ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے علاوہ سنٹرل لائبریری دہلی یونیورسٹی، گاندھی میوزم اینڈ لائبریری نئی دہلی، نہرو میوزیم اینڈ لائبریری نئی دہلی، نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی، ہر دیال میونسپل لائبریری دہلی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، وغیرہ شامل ہیں، ان لائبریریوں کے کارکنان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ضیاء الرحمٰن صدیقی
لیکچرار اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر (حکومت ہند)
سولن، ہماچل پردیش

تحریک آزادیِ ہند

کا

تاریخی پس منظر

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسی حد فاصل تسلیم کی جاتی ہے جہاں ایک دور کا خاتمہ ہوتا ہے اور ایک نئے دور کا آغاز۔ آزادی کی یہ جنگ ایک تاریخی جنگ تھی جو کسی فوری منصوبے کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس کی تیاریوں کا سلسلہ "جنگِ پلاسی" اور میسور کی جنگوں ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ چربی والے کارتوس آزادی کی اس جنگ کے لئے بہانہ بن گئے اور ۱۸۵۷ء میں اس نے شدت اختیار کرلی۔ تحریکِ آزادیِ ہند کا تاریخی پس منظر بیان کرنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ کا ذکر بھی ناگزیر ہے کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہی نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی خشتِ اوّل رکھی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل انگلستان میں یکم دسمبر ۱۶۰۰ء کو ہوئی تھی۔ لندن کے چند انگریز تاجروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل کی تھی جس کا مقصد ہندوستان سے تجارت کرنا تھا۔ اس کمپنی کو ملکہ ایلزبیتھ کے ایک چارٹر کی رو سے ہندوستان میں پندرہ سال کے لئے تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ فرمان ایلزبیتھ چارٹر ELIZABETH CHARTER کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ملکہ ایلزبیتھ کے بعد جیمس اوّل انگلستان میں تخت نشین ہوا اس نے بھی کمپنی کے امور اور مسائل میں گہری دلچسپی لینا شروع کردی۔ ۱۶۰۹ء کو جیمس اوّل کے ایک فرمان کی رو سے کمپنی کو مشرقی تجارت میں "دوامی اجارہ داری PERMANENT SETTLEMENT کے حقوق مل گئے۔ اس فرمان کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاوہ انگلستان کا کوئی بھی تاجر مشرقی ممالک کے ساتھ ذاتی طور پر تجارتی تعلقات قائم نہیں کرسکتا تھا۔ ۱۶۱۵ء میں جیمس اوّل نے سر طامس رو کو اپنا سفیر بنا کر ہندوستان بھیجا۔ سر طامس رو جب ہندوستان آیا وہ جہانگیر کا عہد تھا۔ لوگ آسودہ حال تھے، انگریزی سفیر سر طامس رو نے مغل دربار تک رسائی حاصل کی اور شہنشاہ سے اچھے مراسم قائم کرلئے۔ اس طرح کمپنی کو دربارِ جہانگیری سے ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے

اس موقع کو غنیمت جانا۔ انہوں نے اپنی تجارت کے استحکام کے فروغ کے لئے سورت میں ایک فیکٹری قائم کی۔ اس فیکٹری کے چاروں جانب فصیل بنوائی۔ جہانگیر کے عہد میں آگرہ، اجمیر، احمد آباد، بھراپئے میں بھی انگریزوں نے اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کرلیں۔ جیمس اول کے بعد چارلس اول انگلستان میں تخت نشین ہوا۔ چارلس اول کے عہد میں انگلستان کو مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چارلس اول کے قتل کے بعد گراموبل انگلستان کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے دورِ حکومت میں صنعتی اعتبار سے انگلستان کو فروغ ملا۔ گراموبل کے بعد جلد ہی چارلس اول کا بیٹا چارلس دوم انگلستان کے تخت پر متمکن ہوا۔ اس کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانیوں سے جائز وناجائز ہر طرح سے روپیہ بٹورنا شروع کردیا۔ اس سلسلہ میں ہندوستانیوں پر طرح طرح سے زیادتیاں بھی کی گئیں۔ اورنگ زیب نے ان زیادتیوں کا سدِّباب کیا اور متعلقہ افراد کو سزائیں دیں۔ کمپنی نے عالمگیر سے اپنے افعال کی معافی چاہی اور مصالحت کرلی۔ لہٰذا اورنگ زیب کے ایک فرمان کی رو سے کمپنی کو مغلیہ سلطنت میں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ جیساکہ پنڈت جواہر لال نہرو نے "تلاشِ ہند" میں لکھا ہے:

"ایسٹ انڈیا کمپنی کا سب سے بڑا مقصد جس کے لئے وہ قائم ہوئی تھی یہ تھا کہ ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں خصوصاً یہاں کا کپڑا وغیرہ اور مختلف قسم کے مسالے مشرق سے لے جائے جہاں ان کی بے حد مانگ اور کھپت تھی"[1]

انگریز ہندوستان کے سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے لگے انہوں نے اپنے مقبوضات کو بڑھانا شروع کردیا اور آہستہ آہستہ سیاسی امور میں دخیل ہونے لگے۔ ہندوستانی تجارت پر انگریز اور ولندیزی DUTCH قابض تھے۔ ادھر فرانسیسی بھی ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے لگے۔ انہوں نے بہت جلد پانڈیچیری، چندر نگر، ماہی، کاریگل اور چند دیگر بندرگاہوں پر کوٹھیاں قائم کرلیں۔

باری علیگ اپنی کتاب "کمپنی کی حکومت" میں لکھتے ہیں:۔

"اٹھارھویں صدی کے وسط میں جب انگریزوں اور فرانسیسیوں کے سیاسی اور معاشی مفاد ایک دوسرے سے ٹکرائے تو دوسری جنگوں کے علاوہ ہندوستان میں

---

[1] جواہر لال نہرو "تلاشِ ہند" جلد دوم (اشاعتِ اول ۱۹۴۶ء) ص ۲۸۔

بھی انگریز اور فرانسیسی آپس میں لڑنے لگے۔ ان لڑائیوں کا آغاز کرناٹک میں ہوا۔ تین لڑائیاں ہندوستان کی تاریخ میں اس لئے بہت اہمیت رکھتی ہیں کہ ان لڑائیوں نے جہاں ہندوستان میں فرانسیسیوں کی سیاسی حیثیت کو ختم کر دیا وہاں ان لڑائیوں نے انگریزوں کے لئے مشرق میں ملک گیری کے دروازے کھول دیئے۔[1]

پنڈت جواہر لال نہرو "تلاش ہند" میں انگریزوں کی ہندوستان میں آمد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحکام کا اجمالی خاکہ اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

"سترھویں صدی کے شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو مغل شہنشاہ کی طرف سے سورت میں تجارتی کوٹھیاں بنانے کی اجازت مل گئی اور چند سال بعد انہوں نے جنوب میں ایک قطعہ زمین خریدا اور مدراس کی بنیاد ڈالی گئی ۱۶۶۲ء میں جزیرہ بمبئی چارلس دوم کو پرتگالیوں کی طرف سے بطور جہیز ملا تھا اور اس نے اس کو کمپنی کے نام منتقل کر دیا۔ ۱۶۹۰ء میں شہر کلکتہ کی بنیاد رکھی اس طرح سترھویں صدی کے آخر تک برطانیہ نے ہندوستان میں کئی جگہ ساحل بحر پر قدم جمالئے اور آہستہ آہستہ اندر کی طرف بڑھے ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی میں ایک وسیع رقبۂ زمین پہلی مرتبہ ان کے ہاتھ آیا اور چند ہی سال میں بنگال، بہار، اڑیسہ اور مغربی بنگال پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ پھر ایک بہت بڑا قدم تقریباً چالیس برس بعد انیسویں صدی کے آغاز میں اٹھایا گیا اور وہ دہلی تک جا پہنچے۔ تیسرا اہم قدم ۱۸۱۸ء میں مرہٹوں کی آخری شکست کے بعد ہوا اور چوتھا قدم ۱۸۴۹ء میں جب سکھوں سے جنگ کا سلسلہ ختم ہوا اور برطانوی ہند کا نقشہ مکمل ہو گیا۔"[2]

جنگِ پلاسی

بنگال کے نواب علی وردی خاں نے اپنے بعد اپنے نواسے سراج الدولہ کو بنگال کا نواب مقرر کیا تھا۔ علی وردی خاں انگریزوں کی فریب کاریوں سے بخوبی واقف تھا اور انگریزوں کی حکمت عملی کو سمجھتا تھا۔ وہ انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکال دینا

---

[1] باری علیگ "کمپنی کی حکومت" (طبع چہارم ۱۹۶۹ء) ص ۳۔

[2] جواہر لال نہرو "تلاش ہند" (جلد دوم اشاعت اول ۱۹۴۶ء) ص ۲۲-۲۳۔

چاہتا تھا لیکن اس کی عمر نے وفا نہ کی، مرنے سے قبل اس نے اپنے جانشین سراج الدولہ کو ان الفاظ میں نصیحت کی تھی :۔

"مغربی قوموں کی اس قوت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا جو انہیں ہندوستان میں حاصل ہے اگر میری عمر کا پیمانہ لبریز نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اس اندیشہ کو بھی ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتا، اس کام کی تکمیل تیرے ذمہ ہے۔"

"میرے چراغ ! دکن میں ان کی سرگرمیوں سے سبق حاصل کرو، ذاتی جنگوں میں اُلجھ کر انہوں نے اکبر اعظم کی رعایا کے اموال و املاک پر قبضہ جما لیا ہے۔ ایک وقت میں تینوں قوتوں کو تباہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ سب سے پہلے انگریزوں کی قوت کو توڑنا۔۔۔ سنو بیٹا ! انہیں سپاہی رکھنے اور قلعہ بنانے کی اجازت نہ دینا۔ اگر ایسا ہوا تو بنگال تمہارا نہیں [۱]"

۱۹ اپریل ۱۷۵۶ء کو علی وردی خان کی وفات کے بعد سراج الدولہ بنگال کا نواب ہوا تو انگریزوں نے اس کی مخالفت کی اور رسم کے مطابق نذر نہیں پیش کی۔ انگریزوں کے اس رویّے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز سراج الدولہ کی تخت نشینی سے خوش نہیں تھے۔ اس کے برعکس وہ نواب کے خلاف فریب کاریوں اور ریشہ دوانیوں کے جال پھیلانے میں منہمک ہو گئے۔ انگریزوں نے کلکتہ کے قلعہ کی مرمت کرانی شروع کر دی۔ مزید برآں نواب کے مخالفین کرشن داس وغیرہ کو اپنے ہاں پناہ دی۔ کرشن داس ڈھاکہ کے دیوان راجہ بلب کا بیٹا تھا۔ جو انگریزوں کے لئے فائدہ مند تھا۔ ان حالات نے سراج الدولہ کو انگریزوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے پر مجبور کر دیا اور اس نے فرنگیوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کا مصمم عزم کر لیا۔

چنانچہ ایک انگریز مورخ ہل اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :۔

"سراج الدولہ کا انگریزوں پر حملہ حق بجانب تھا [۲]"

زین لا نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے :۔

"انگریزوں نے دربار سراج الدولہ سے تمام تعلقات منقطع کر لئے ہیں، بارہا انہوں نے

---

[۱] باری علیگ "کمپنی کی حکومت" جلد چہارم ۱۹۶۹ء ص ۱۰۳۔

سراج الدولہ کو قاسم بازار کی فیکٹری میں جانے سے روکا۔[1]

کلائیو اور سراج الدولہ کی فوجیں ۲۱ جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کے میدان میں اتر آئیں۔ ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو زبردست معرکہ ہوا جس میں اپنے ہی کچھ جرنیلوں کی غداری کی بدولت سراج الدولہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا اور بالآخر جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ میر جعفر، درلب رام، جگت سنگھ اور یار لطف خان وغیرہ نے کلائیو سے مل کر نواب کے ساتھ غداری کی لیکن میر میدان اور موہن لال نے انگریزوں کا جم کر مقابلہ کیا۔ میر میدان زخمی ہو کر گرا اور جاں بحق ہو گیا۔ میر میدان کی موت سے نواب دل شکستہ ہو گیا۔ ادھر میر جعفر کے پیہم اصرار پر سراج الدولہ نے موہن لال کو بھی میدان سے واپس بلا لیا۔ نواب کی فوج منتشر ہو گئی اور اس طرح فوج میں تباہی مچ گئی۔ جنگ کے بعد سراج الدولہ کو گرفتار کر لیا گیا اور وہ میر جعفر کی حراست میں رہا۔ رات کو میر جعفر کے بیٹے میرن نے اسے قتل کر دیا۔ سراج الدولہ کی شہادت پر رام نرائن موزوں نے اس سے اپنے تعلق خاطر کو اس شعر کے ذریعے ظاہر کیا ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

پلاسی کی اس فیصلہ کن جنگ نے انگریزوں کے ہندوستان میں پیر جما دیئے۔ اس جنگ میں شکست سے دوچار ہونے کے بعد ہندوستانیوں کے دلوں میں انتقام کے شعلے بھڑکتے رہے اور وہ پلاسی کے میدان میں اس تاریخی جنگ کی یاد تازہ کرتے رہے۔ ہندوستان کے غیور فرزندوں کے دلوں میں اپنے ملک کی محبت کا جذبہ بیدار رہا۔ جنگ کے سو سال بعد یعنی ۱۸۵۷ء میں وہ یہ کہہ کر میدان میں اتر آئے "آج ہم پلاسی کا بدلہ لیں گے"۔ جنگ پلاسی میں ہندوستانیوں کی شکست کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کلائیو نے اپنی سازشوں سے نواب کے خاص سپہ سالاروں میں پھوٹ ڈال دی تھی۔ کلائیو اپنی زبان پر قائم نہ رہا۔ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ کمپنی کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لئے کیا۔

انگریز اپنی سازشوں میں کامیاب ہو گئے اور سراج الدولہ کو قتل کر دیا گیا۔ سراج الدولہ

---

[1] باری علیگ "کمپنی کی حکومت" (طبع چہارم ۱۹۶۹ء) ص ۱۰۴

کے قتل کے بعد حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا نام ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ حیدر علی انگریزوں کے خلاف آخر تک لڑتا رہا۔ حیدر علی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوالفتح ٹیپو سلطان تخت نشین ہوا۔ وہ ایک ذی شعور، جری، شجاع اور دانشمند انسان تھا۔ اس نے کہا تھا: "ہندوستان صرف ہندوستانیوں کے لئے ہے"۔

"تاریخ سلطنت خداداد" کا مصنف محمود بنگلوری رقمطراز ہیں:

"وہ (ٹیپو سلطان) انگریزوں کی چیرہ دستیوں سے واقف ہوچکا تھا۔ سلطان نے ہندوستانیوں کو ایک مرکز پر لانے کی کافی جدوجہد کی۔ اس سے ایسٹ انڈیا کمپنی مخالف ہوگئی۔ وہ تمام عمر انگریزوں سے جنگ کرتا رہا"۔[1]

سرجان ایلس شروتھر جو اس وقت کلکتہ کا چیف جسٹس تھا ٹیپو سلطان کی موت پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"ٹیپو کی طاقت ہی ہماری فوجوں کو شکست دینے کے لئے کافی تھی۔ اس کے مرتے ہی ہندوستان میں ہمارا (انگریزوں کا) قبضہ ہمیشہ کے لئے ہوگیا"۔[2]

ٹیپو سلطان نے اپنے ملک کی خاطر جان دے دی اور انگریزوں سے کبھی ہار نہیں مانی۔ وہ آخر تک لڑتا رہا اور لڑتے لڑتے جاں بحق ہوگیا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء، اسباب و علل

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی مورخین اور اُدبا کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ انگریز مورخین نے اس جنگ کو غدر، بغاوت اور فوجی شورشوں کے نام سے موسوم کیا ہے اور وہ اسے جنگِ آزادی کی پہلی جنگ تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ غدر تھی نہ بغاوت اور نہ فوجی شورش، صحیح معنوں میں یہ تحریک تھی جس کو ہندوستان کے حریت پسند عوام نے انگریز عملداری کے جبر و تشدد اور جور و ستم سے تنگ آکر انگریز سامراج کے خلاف لڑی تھی۔ کوئی بھی غیر جانبدار مورخ اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ اس جنگ کا مقصد محض ملک کی آزادی اور اپنی تہذیبی

---

[1] محمود بنگلوری "تاریخ سلطنت خداداد" اشاعتِ اول ۱۹۷۰ء ص ۱۵
[2] 〃 〃 〃 〃 ص ۱۷

اقدار کی حفاظت تھا اس کے برعکس انگریزوں کا مقصد ملک و قوم پر اپنا تسلط جمانا، ہندوستان کے عوام پر مظالم توڑنا اور آمرانہ نظام قائم رکھنا تھا۔

انگریز حکام کے مسلسل مظالم سے ہندوستانیوں کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی اور مسلسل تکالیف، مصائب اور لوٹ کھسوٹ سے ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ مصحفی نے اس سلسلے میں لکھا ہے ؎

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

۱۸۵۶ء تک لارڈ ڈلہوزی ہندوستان کا گورنر جنرل رہا۔ اس نے اپنی طاقت کا بھرپور استعمال کر کے ہندوستان میں کمپنی کی بنیادوں کو استوار کیا۔ باری علیگ اپنی کتاب "کمپنی کی حکومت" میں ڈلہوزی کے بارے میں لکھتے ہیں:-

" لارڈ ڈلہوزی نے ہندوستان میں کمپنی کی فتوحات کو مکمل کر دیا تھا۔ انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں فورٹ ولیم کالج میں ہندوستان کی تسخیر کا جو خاکہ تیار ہوا تھا اس میں ڈلہوزی نے سُرخ رنگ بھر دیا۔ ہندوستان ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک کمپنی کے قبضے میں آگیا۔"[۱]

لارڈ ڈلہوزی ۱۸۵۶ء میں مستعفی ہو گیا اور اسی سال لارڈ کیننگ ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ ہندوستان آتے وقت لندن میں منعقدہ ایک الوداعی پارٹی میں تقریر کرتے ہوئے کیننگ نے کہا تھا:

" میری خواہش ہے کہ میرا عہدِ حکومت پُر امن رہے لیکن میں اس بات کو نہیں بھول سکتا کہ ہندوستان کی فضا میں بادل کا ایک ٹکڑا دکھائی دے گا۔ اتنا چھوٹا کہ جتنا انسانی ہاتھ لیکن یہ ٹکڑا اتنا بڑا ہو جائیگا کہ خود ہمارا وجود خطرے میں پڑ جائیگا۔"[۲]

کیننگ کے مذکورہ بالا بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دور رس اور دانشمند انسان تھا اس کی پیش گوئی صادق آئی جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی شکل میں رُونما ہوئی۔

---

[۱] باری علیگ "کمپنی کی حکومت" ص ۳۸۳۔
[۲] ص ۳۶۸۔

وہ کیا اسباب تھے جن سے ہندوستان کے عوام اور دیسی سپاہ کے دلوں میں انگریز سامراج کے خلاف نفرت پیدا ہوگئی اور وہ بغاوت پر اُتر آئے۔ ذیل میں اس طرح ان اسباب کو مجملاً بیان کیا جارہا ہے۔

لارڈ ڈلہوزی نے لیپس LAPSE کی پالیسی لاگو کی جس کے تحت سات ریاستوں ستارا، ناگپور، سمبل پور، جھانسی، جیت پورہ، تجورہ اور کرناٹک وغیرہ کو انگریزی راج میں شامل کرلیا۔ لیپس کا مطلب یہ تھا کہ جن ہندوستانی راجاؤں نے کمپنی کے ساتھ دوستی کا صلح نامہ کیا تھا ان میں سے کسی کے مرجانے کے بعد اگر اس کے کوئی بیٹا نہ ہوتا تو اس کی ساری ریاست پر انگریزی حکومت کا حق ہوجاتا تھا اور کمپنی اس پر قبضہ کرلیتی تھی۔

لارڈ ڈلہوزی کی اس پالیسی سے ارکانِ ریاست انگریزوں کے خلاف ہوگئے۔ ان میں احمد اللہ، ناناصاحب، راؤصاحب، تانتیا ٹوپی، عظیم اللہ خاں، رانی جھانسی، کنور سنگھ، بہادر شاہ کا رشتہ دار فیروز شاہ وغیرہ شامل تھے۔

بغاوت کی دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ شہنشاہ دہلی کے ساتھ انگریز عملداری کا رویہ اچھا نہیں تھا اور بادشاہ دہلی کے ساتھ مسلسل نامناسب سلوک کیا جاتا تھا۔ بغاوت کا ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ انگریزوں نے اودھ کے حکمراں واجد علی شاہ کے ساتھ بھی نامناسب برتاؤ روا رکھا۔ مزید برآں عیسائیوں کے مبلغ مختلف مقامات پر جاتے اور عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتے۔ اسکولوں میں عیسائی مذہب کے مطابق تعلیم دی جاتی اور بچوں سے بھی عیسائی مذہب سے متعلق سوالات کئے جاتے جو عیسائی مذہب کے مطابق ان سوالوں کا جواب دیتا اس کو انعامات سے سرفراز کیا جاتا۔ انگریزوں کے اس مذہبی مداخلت سے ہندوستانی عوام کے دلوں میں شکوک پیدا ہوگئے اور ان کو یہ اندیشہ ہوگیا کہ انگریز ان کے مذہب کو ختم کردینا چاہتے ہیں۔

"اسباب بغاوت ہند" میں سرسید احمد خاں رقمطراز ہیں:۔

"پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقاموں کو بہت بُرائی اور ہتک سے یاد

کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور تکلیف پہنچتی تھی اور ہماری ناراضگی کا بیج لوگوں کے دلوں میں بویا جاتا تھا۔[1]

عیسائی مذہب کی تبلیغ نہ صرف عوام میں کی گئی بلکہ فوج میں بھی اس کا خوب پرچار کیا گیا۔ کچھ افسر تو محض اسی غرض سے فوج میں اعلیٰ عہدوں پر معمور تھے کہ ہندوستانی سپاہ کو لالچ دیکر انھیں عیسائیت میں داخل کرلیا جائے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستانی سپاہ رفتہ رفتہ انگریزوں سے متنفر ہونے لگی۔

بنگال کی پیدل فوج کے ایک انگریز کمانڈر نے اپنی سرکاری رپورٹ میں لکھا ہے:۔

"میں لگاتار اٹھائیس سال سے ہندوستانی سپاہیوں کو عیسائی بنانے کی پالیسی پر عمل کر رہا ہوں اور غیر عیسائی کی روح کو شیطان سے بچانا میرے لئے فوجی فرض کا ایک جز بن گیا ہے۔"[2]

سرسید احمد خاں "اسباب بغاوت ہند" میں لکھتے ہیں:۔

"مداخلت مذہبی میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور ناقابل اور ادنیٰ و اعلیٰ جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم ورواج میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو کیا مسلمان عیسائی مذہب اور اپنے ملک کے رسم ورواج پر ڈالے اور سب سے بڑا سبب اس سرکشی کا یہی ہے۔"[3]

سرسید احمد خاں نے ہندوستان میں اس بغاوت کا جو سب سے بڑا سبب بتایا ہے وہ یہ ہے کہ لیجس لیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کو شریک نہ کیا گیا۔ وہ بغاوت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادات اور ان کے مصائب سے جو ان پر گذرتی تھیں اور جس سے رعایا کا دل گورنمنٹ

---

[1] سرسید احمد خاں "رسالہ اسباب بغاوت ہند" اگست ۱۹۵۸ء ص ۴۵-۴۴۔
[2] پنڈت سندر لال "سن ستاون" اشاعت ۱۹۵۷ء۔ ص ۴۶
[3] سرسید احمد خاں "اسباب بغاوت ہند" ایڈیشن ۱۹۵۸ء۔ ص ۴۳

پھٹا جاتا تھا۔[1]

راقم الحروف سر سید احمد خان کی مذکورہ بالا رائے سے متفق نہیں ہے اور انگریز مورخین بھی اس بات کے شاہد ہیں کہ گورنمنٹ رعایا کے تمام تر مصائب اور تکلیفوں و پریشانیوں سے بخوبی واقف تھی اور جان بوجھ کر انگریزوں نے ہندوستانی عوام اور خصوصاً مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جس سے ان میں غم و غصہ پیدا ہو گیا۔ یہ لاوا ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی شکل میں پھٹ کر رہا۔

ایک فرانسیسی خاتون نے غدر کے مناظر کو بیان کرتے ہوئے اپنی سرگذشت میں لکھا ہے:۔

"اکبر آباد اور اس کے علاوہ بڑے بڑے شہروں میں اس قسم کی بغاوت کی خبریں نہ سُنی جاتی تھیں لیکن ہندوستانی ملازموں کی صورت سے نارضامندی کی علامتوں اور بغاوت کے اثرات نمایاں تھے۔ یہ لوگ انگریزوں کی طرزِ حکومت اور غلبہ سے اسقدر تنگ آگئے تھے کہ اپنے خیالات کی پردہ داری نہ کر سکتے تھے۔"[2]

چاروں طرف غدر کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ عوام اور سپاہ متنفر ہو چکی تھیں۔ طرح طرح سے بغاوت کے پروپیگنڈے کئے جا رہے تھے۔ اشتہارات چسپاں ہو رہے تھے۔ اسی اثنا میں جدید طرز کے چربی والے کارتوس آئے جو سور اور گائے کی چربی سے تیار کئے گئے تھے۔

پنڈت سندر لال اپنی کتاب "سن ستاون" میں چربی والے کارتوسوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"بیرک پور کے پاس ان کارتوسوں کو بنانے کے لئے ایک کارخانہ کھولا گیا۔ ایک دن دم دم گلے ایک برہمن سپاہی پانی کا لوٹا ہاتھ میں لئے بیرک پور کی طرف جا رہا تھا۔ اتفاق سے ایک مہتر نے آکر پانی پینے کے لئے سپاہی سے لوٹا مانگا۔ سپاہی نے ہندو رواج کے مطابق لوٹا دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر مہتر نے کہا تم اب جات پات کا گھمنڈ نہ کرو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بہت جلد ہی تمہیں اپنے دانتوں سے

---

[1] سر سید احمد خاں "اسباب بغاوت ہند" ایڈیشن، ۱۹۵۷ء ص ۵۶۔ [2] پروفیسر ظفر تاباں (مترجمہ) "غدر کے مناظر" اشاعتِ اول ۱۹۳۵ء، ص ۱۸۔

گائے کا گوشت اور سُور کی چربی کاٹنی پڑے گی[1]"

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے سلسلے میں "سر جان کے" بھی اس بات کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اس چمکتے مسالے کو بنانے میں گائے اور سُور کی چربی کو استعمال کیا گیا تھا[2]"

ہندوستانی سپاہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ ان کارتوسوں کو استعمال کریں جن لوگوں نے انکار کیا انھیں سخت سزائیں دی گئیں اور تمام فوج کے سامنے سرِ میدان وردیاں اتار دی گئیں، اور بیڑیاں پہنا کر دس دس سال کی قید کا حکم سُنایا گیا۔ دیسی سپاہ غم و غصہ سے بیتاب تھی لیکن مجبور و لاچار کھڑی تماشا دیکھتی تھی۔ نتیجہ کے طور پر ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو دیسی سپاہ نے اپنی بیرک میں آگ لگا دی اور بغاوت کا اعلان کر دیا۔ کرنل فینی باغی سپاہیوں کو انکے فرائض کا احساس دلانے کے لئے آگے بڑھا تو ایک سنسناتی ہوئی گولی نے کرنل کو ختم کر دیا۔ کرنل فینی پہلا انگریز کرنل تھا جو باغی سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کے بعد جو انگریز افسر، عورتیں، بوڑھے، بچے دکھائی دیئے انھیں قتل کر دیا۔ دوسرے روز یعنی ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو باغی دلی پہنچے، اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں حاضر ہوئے۔ سلامی دی اور عرض کیا:۔

"حضور! انگریز عملداری کے نامناسب برتاؤ اور زیادتیوں سے تنگ آکر اور جب حکومت نے ہمارے دھرم میں مداخلت کی اور چکنی چربی والے کارتوسوں کو استعمال کرنے پر مجبور کیا تو ہم نے یہ سب کیا۔ باغی کہتے تھے، اگر ہم یہ نہ کرتے تو کیا کرتے ایک نہ ایک دن سرکار ہم کو تباہ کر دیتی[3]"

جب باغی سپاہی بہادر شاہ ظفر کے پاس کمک کے لئے پہنچے تو انہوں نے باغیوں کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ وہ کشت و خون کے حق میں نہیں تھے۔ اور باغیوں سے کہا کہ میں نے ریزیڈنٹ صاحب کو بلوایا ہے اس سلسلے میں ان سے گفت و شنید کروں گا۔ ریزیڈنٹ صاحب کے

---

[1] پنڈت سندر لال "سن ستاون" اشاعت ۱۹۵۷ء ص ۶۲-۶۱۔ [2] باری علیگ "کمپنی حکومت" ص ۳۸۶۔
[3] سر سید احمد خان "اسباب بغاوت ہند" ص ۴۵۔

آنے پر گفتگو کے دوران ایک باغی نے گولی چلادی۔ ریزیڈنٹ بال بال بچا۔ اس کے بعد سپاہ نے قتل وغارت گری کا سلسلہ شروع کر دیا اور ہندوستان کے مختلف اطراف میں پھیل گئے۔

جنگ آزادی کے جانبازوں میں جرنل بخت خان کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے بخت خاں کی قیادت میں بریلی، شاہجہاں پور، مراد آباد، اور بدایوں سے باغی فوج ہتھیاروں سے مسلح دہلی پہنچی، اس کے بعد بغاوت ملک گیر پیمانے پر شروع ہوگئی۔ بخت خان نے ملک گیر سطح پر باغی فوج کی قیادت کی اور وہ آخر تک لڑتا رہا۔ جنگ کی ناکامی کے بعد بخت خان غائب ہوگیا اور آج تک اس کا سراغ نہ مل سکا۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ملک گیر سطح پر ہونے والی بغاوت کسی مخصوص طبقے یا فرقے کی جنگ نہیں تھی اور نہ ہی کسی منصوبے کے تحت لڑی گئی تھی بلکہ یہ لاوا تو جنگ پلاسی سے پک رہا تھا، جو ۱۸۵۷ء میں اچانک پھوٹ پڑا، ملک گیر پیمانے پر پھیلنے والی اس تحریک میں ہندو مسلمان اور سکھوں نے کاندھے سے کاندھا ملا کر اپنے وطن کی آزادی اور تہذیب کی حفاظت کے لئے جنگ کی تھی۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی وجوہ

ملک گیر سطح پر اس بغاوت کی تاریخ ۳۱ مئی طے پائی تھی۔ اسی اثناء میں چربی والے کارتوس آئے اور ہندوستانی سپاہ کو اس کو استعمال کرنے پر مجبور کیا گیا۔ دیسی سپاہ نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کیا تو انھیں سخت سزائیں دیں۔ میرٹھ کے حریت پسندوں سے صبر نہ ہو سکا اور ابھی کو منگل پانڈے نے ایک انگریز افسر پر گولی چلادی۔ جو منصوبہ بغاوت کو شروع کرنے کا ہندوستانیوں نے بنایا تھا اس سے قبل ہی جنگ کا آغاز کر دیا گیا، اگر جنگ کا آغاز طے شدہ تاریخ یعنی ۳۱ مئی کو بیک وقت پورے ہندوستان میں ہوا ہوتا تو انگریز حکمرانوں کا ہندوستان پر قبضہ آسان نہ ہوتا۔

ہندوستانی اس جنگ میں ناکام ہوئے، ناکامی کی بعض اہم وجوہ تھیں۔ ہندوستان کے اعلیٰ طبقے اور والیان ریاست نے اس تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ بلکہ اس کے برعکس انہوں نے برطانوی حکومت کی مدد کی۔ زمیندار طبقے کو اس بات کا خدشہ تھا کہ جو جاگیریں انگریزوں سے انھیں ملی

ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جاگیریں ان سے چھن جائیں۔

ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستانی کسی ایسے مرکزی لیڈر کا انتخاب نہ کر سکے جو پوری تحریک کی مجموعی قیادت سنبھالنے اور مختلف علاقوں اور طبقوں کے افراد کو متحد کرنے کی صلاحیت کا حامل ہوتا۔ ہندوستانیوں کے پاس جدید ہتھیار بھی نہیں تھے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی بھی کمی تھی۔ سب سے زیادہ یہ کہ وہ کسی طرح منظم نہیں تھے اس لئے وہ باقاعدہ محاذ بنا کر نہیں لڑے۔ انگریزوں نے ڈاک اور تار کے نظام سے بھی فائدہ اٹھایا۔ جبکہ ہندوستانیوں کو اس سلسلے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں کو گوالیار کے شنکر راؤ، حیدرآباد کے سالار جنگ، نیپال کے جنگ بہادر مان بہادر سنگھ اور سکھوں کی بھی حمایت حاصل تھی۔

اس کے برعکس انگریز منظم طریقے سے جنگ کرتے رہے۔ ان میں نہ جذبے کی کمی تھی اور نہ جدید قسم کے ہتھیاروں کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستانی رہنماؤں کی ناکامی اور شکست کی وجوہ سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> "بغاوت کے سربراہوں میں کبھی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ وہ ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف مسلسل سازشیں کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے برخلاف انگریز اپنی ملکہ کے تئیں وفاداری کے جذبے کے تحت لڑ رہے تھے۔"[1]

ہندوستانی جانبازوں میں رانی لکشمی بائی (جھانسی کی رانی)، روہیل کھنڈ کا بخت خاں، اودھ کی بیگم حضرت محل، تانتیا ٹوپے، احمد شاہ، خان بہادر، کنور سنگھ وغیرہ ایسے قابلِ فخر لوگ تھے جو برطانوی سپاہ اور کمانڈروں سے کسی طرح کم نہ تھے لیکن ان کی طاقت منتشر تھی۔ ان کا کوئی مرکزی محاذ نہیں تھا جہاں سے ان کی فوجوں کی تنظیم ہوتی اور مختلف علاقوں میں برسرِ پیکار ہوتے ان میں آپسی تال میل ہوتا۔ یہ بہادر منظم طور پر اور مشترکہ کمان کے تحت لڑنے کے بجائے اپنے اپنے طور پر ہندوستان کے مختلف اطراف میں بہادری کے جوہر دکھا رہے تھے۔

---

[1] آجکل "آزادی نمبر" اگست ۱۹۵۷ء ص ۴۔۵۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے المناک نتائج اور اثرات

۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا باب ہے جو خونی واقعات سے لبریز نظر آتا ہے اس قیامت صغریٰ کے حالات و کوائف بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بغاوت ناکام ہو گئی۔ بغاوت کے فرو ہونے کے بعد انگریزوں کے سفاکانہ انتقام اور قتل و غارتگری کا سلسلہ شروع ہو گیا مسلمان خاص طور پر انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنے۔ ان کی صنعت و حرفت تباہ کر دی گئی۔ انھیں طرح طرح سے اذیتیں دی گئیں ان کے دین و ایمان کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ انگریزوں کے مسلسل مظالم اور زیادتیوں سے تنگ آ کر جب ہندوستانیوں نے نجات پانی چاہی تو انھیں سختی سے کچلا گیا اور انگریزوں نے انھیں ایسی عبرت ناک سزائیں دیں کہ وہ چنگیز خاں سے بازی لے گئے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی ۱۸۵۷ء کا پس منظر بیان کرتے ہوئے "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ" میں لکھتے ہیں :-

" ۱۸۵۷ء ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قدیم اور جدید کے درمیان وہ منزل ہے جہاں سے ماضی کے نقوش پڑھے جا سکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے دامن میں ایک ایسی تہذیب نے پرورش پائی تھی جو رنگ و نسل، مذہب و ملت کے سارے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک عرصہ تک ہندوستان کی سیاسی وحدت کی ضامن رہی تھی۔ یہاں پہنچکر دم توڑ دیتی ہے۔ اور اس کے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ پرانے سماجی نظام اور پرانے نظریات وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور نئی سماجی قوتیں صرف فکر و نظر کے سانچے ہی کو توڑنے پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ زندگی کے سارے محور بدل دیتی ہیں"[1]

جب ہم ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں انگریزوں کے مظالم پر نظر ڈالتے ہوئے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے اور کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ہندوستانیوں کو شارع عام پر پھانسیاں دی گئیں۔

---

[1] خلیق احمد نظامی "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ" اشاعت ۱۹۵۸ء ص ۳۔

خلیق نظامی رقمطراز ہیں:۔

"لڑائی کے اختتام پر بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور یہ معلوم ہونے پر کہ وہ اس قسم کی موت کی کوئی خاص پرواہ نہیں کرتے تو ان میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھ کر اُڑا دیا گیا۔ ایک روز توپ کے بہت بڑے دھماکے سے ہم چونک پڑے جس کے ساتھ ہی ایک ناقابل بیان دھیمی مگر وحشت ناک چیخ بھی سُنائی دی۔ دریافت کرنے پر ایک افسر نے ہمیں بتایا کہ یہ ایک نہایت ہی کرب انگیز نظارہ تھا۔ یعنی ایک توپ میں اتفاق سے بارود زیادہ بھرا ہوا تھا جن کے چلائے جانے سے بدقسمت ملزم کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضائے آسمانی میں اُڑا اور تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے"[1]

دہلی میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا ذکر کرتے ہوئے خلیق احمد نظامی رقمطراز ہیں:۔

"سب سے زیادہ عبرتناک دہلی کی تباہی تھی۔ وہ صرف ایک ہی ہنگامی تحریک کا ہی مرکز نہ تھی بلکہ ایک تمدن کی آخری نشانی تھی۔ وہاں کی ہر چیز اپنی تاریخ رکھتی تھی۔ انگریزوں نے اس کی تباہی و بربادی میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی۔ چوک سعد اللہ خاں، اُردو بازار، خانم کا بازار، پلاقی بیگم کا کوچہ، دریا گنج کی گھاٹی، کلیوں کا بازار، پنجابی کٹرا، دھوبی کٹرا، رام گنج، سعادت خاں کا کٹرا، رام جی داس کا گودام والے کے مکان کے علاوہ شاہی درسگاہ، دارالبقا، اکبر آبادی مسجد، اورنگ آبادی مسجد، چوبی مسجد کو اس طرح مسمار کیا کہ نام و نشان تک باقی نہ چھوڑا"[2]

مسلمانوں کی سزا جو عبرتناک طریقہ انگریزوں نے اختیار کیا تھا کہ وہ سیخیں گرم کر کے باغیوں کو داغتے تھے۔ اس کے تصور سے بھی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انقلاب کی ناکامی کے بعد مسلمان براہِ راست طور پر متاثر ہوئے اور کثرت کے ساتھ انگریزوں کی تہذیب و مظالم کا نشانہ بنے کیونکہ مسلمانوں کا اس تحریک میں سب سے زیادہ حصہ رہا تھا۔

---

[1] خلیق احمد نظامی "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ" ص ۱۲۔
[2] " " " ص ۹۔

انگریزوں کے سفاکانہ انتقام کا ذکر کرتے ہوئے خلیق نظامی لکھتے ہیں :

"ہزاروں مسلمان معمولی معمولی شبہات پر تہ تیغ کر دیئے گئے۔ ہزاروں مسلمان گھرانے نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے اور سینکڑوں شریف خاندان بے کسی اور مفلسی کے عالم میں در در مارے پھرنے لگے۔" [لے]

پنڈت سندر لال "رسل" کے حوالے سے مسلمانوں پر توڑے گئے مظالم کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"مسلمانوں کو مارنے سے پہلے انھیں سور کی کھالوں میں سی دیا جاتا تھا۔ ان پر سور کی چربی مل دی جاتی تھی اور پھر ان کے جسم جلا دیئے جاتے تھے۔" [لے]

فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹ نے اپنی کتاب "ہندوستان میں اکتالیس سال" میں ۱۸۵۷ء کے دلدوز واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"۱۸۵۷ء کے غدر میں ستائیس ہزار باغی مسلمانوں کو پھانسی دی گئی اور قتل عام میں جو مسلمان مارے گئے ان کا کوئی شمار نہیں۔"

غرض یہ کہ مسلمان مرد، عورت، بوڑھوں اور بچوں کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ غدر کے بعد جب مسلمانوں کی آبادی کا تخمینہ کیا گیا تو پہلے کی بہ نسبت ایک چوتھائی آبادی بھی باقی نہ رہی تھی۔ بغاوت کے اہم مراکز میں میرٹھ، دہلی، لکھنؤ اور روہیلکھنڈ کے نام خاص طور پر سامنے آئے ہیں۔ ان کے علاوہ بجنور، مراد آباد اور امروہہ وغیرہ کے حریت پسندوں نے بھی اس جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ دہلی میں خصوصیت کے ساتھ مسلمان انگریزوں کے تعذیب و تشدد کا نشانہ بنے۔ ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی ایک انگریز افسر کا بیان نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ہم نے اس قسم کی سینکڑوں عورتوں کو کنوؤں سے زندہ نکالا جو کنوؤں میں لاشوں کے سبب جگہ نہ ہونے سے ڈوبی نہ تھیں اور زندہ پڑی تھیں یا بیٹھی تھیں جس وقت ہم نے انھیں نکالنا چاہا تو وہ چیخنے لگیں کہ برائے خدا ہم کو ہاتھ نہ لگاؤ اور گولی سے مار

RUSSILES DIARY VOL II P. 43

لے خلیق احمد نظامی "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ" ص ۵۸۔ لے بحوالہ سندر لال ص ۱۶۵

ڈالو، ہم شریف بہو بیٹیاں ہیں۔ ہماری آبرو خراب نہ کرو۔ اور جب ہم ان کو باہر نکالتے تو وہ ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگتیں تھیں اور بعض ان میں بیہوش ہوکر گر پڑتی تھیں۔[1]

انگریز مؤرخین خود بھی ان مظالم کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کی تواریخ میں بھی یہ واقعات جہاں تہاں مل جاتے ہیں۔

مولانا سیّد احمد علوی اسپنسر والپول کے حوالے سے دہلی کی قتل و غارتگری کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"وحشی نادر شاہ نے بھی وہ لوٹ نہ مچائی تھی جو فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج نے جائز رکھی۔ شارعِ عام پر پھانسی گھر بنائے گئے اور پانچ پانچ چھ چھ آدمیوں کو روزانہ سزائے موت دیجاتی تھی۔ والپول کا بیان ہے کہ تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی جن میں اُنتیس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤلف قیصر التواریخ لکھتا ہے کہ ستائیس ہزار مسلمان قتل کئے گئے اور سات دن تک برابر قتل عام جاری رہا۔"[2]

دہلی دوبارہ انگریزوں کے قبضے میں آگئی اور انگریزوں کی انتقامی کارروائی کا سلسلہ شروع ہوگیا بخت خاں (جو باغی سپاہیوں کا لیڈر تھا) نے بہادر شاہ ظفر کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے اصرار کیا لیکن مرزا الٰہی بخش جو میجر ہڈسن کا مخبر تھا اس نے بیگم زینت محل اور بادشاہ کو بخت خان کے ساتھ جانے سے روک دیا۔ ادھر مرزا الٰہی بخش نے ہڈسن کو اطلاع کردی اور ہڈسن نے فوج کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے کا محاصرہ کرلیا۔ بہادر شاہ ظفر، زینت محل اور نوعمر شہزادے جواں بخت کو گرفتار کرلیا گیا۔ جنرل بخت خان اپنی فوج کے ساتھ دلّی سے چلا گیا۔ اور آج تک اس کا پتہ نہیں چل سکا۔

دہلی کو فتح کرنے کے بعد انگریز ملک کے مختلف اطراف میں پھیل گئے اور انتقام لینے شروع کردیئے۔

"فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے سارے ملک کو انتقامی آگ کے شعلوں میں

---

[1] خواجہ حسن نظامی "دہلی کی جانکنی" اشاعت دوم ۱۹۲۵ء ص ۶۱-۶۲۔ [2] سید احمد علوی "افسانۂ غم" ص ۲۸-۲۹۔

ڈال دیا اور قتل و غارت گری کا ہنگامہ برپا کیا جس کی مثال انیسویں صدی کی تاریخ میں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتی۔ ہزاروں معصوم اور بے گناہ انسان اس ظلم و بربریت کا شکار ہو گئے[1]۔"

دہلی کے بعد جو شہر انگریزوں کی بربریت کا سب سے زیادہ نشانہ بنا وہ لکھنؤ تھا، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ یہ شہر بھی فرنگیوں کی تباہ و بربادی سے نہ بچ سکا۔ چنانچہ "تاریخ لکھنؤ" کا مصنف لکھنؤ کی تباہی کا حال بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہے:۔

"مجاہدین آزادی کی شکست کے بعد شہر لکھنؤ تقریباً پندرہ دن تک لٹتا رہا۔ ہزاروں بے روزگار قتل کر دیئے گئے۔ سینکڑوں با عصمت خواتین نے حفظ ناموس کی خاطر خودکشی کر لی۔ دولت مند نان شبینہ کو محتاج ہو گئے مگر سامراج کا غیظ و غضب اس پر بھی کم نہ ہوا اور یہ حکم ہوا کہ جہاں جہاں باغیوں نے قیام کیا ہو اور جہاں کے باشندوں نے ان کی مدد کی ہو ان سب محلوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ چنانچہ دریائے گومتی کے کنارے جتنے بھی مکانات تھے یا تو نذرِ آتش کر دیئے گئے یا بارود لگا کر اڑا دیئے گئے۔ شہر کے کتنے محلے اور بازار تھے جن کا آج نام و نشان تک نہیں[2]۔"

مذکورہ حوالوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے حریت پسندوں پر ظلم و ستم ڈھانے میں کوئی کمی اٹھا نہیں رکھی۔ مصنف "آکسفورڈ تاریخ ہند" اپنی مخصوص زبان میں اس منظر کو اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"یہ بغاوت اپنے پیچھے بے شمار خوفناک حوادث بے انتہا مصائب اور متعدد ایسے مکروہ اور رنجیدہ واقعات چھوڑ گئی ہے جن کے ذکر سے بھی قلب کو صدمہ پہنچتا ہے[3]۔"

انقلاب مکمل طور پر ناکام رہا۔ اس عظیم شکست سے ہندوستانیوں نے کچھ تجربات حاصل کئے جس سے مستقبل میں وہ قومی تحریک کی اساس کو استوار کرنے کے لائق ہو گئے اور اس طرح ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا۔

---

[1] خلیق احمد نظامی "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ" ص ۵۱۔ [2] امجد علیخاں "مختصر تاریخ اودھ" اشاعت اول ۱۹۶۰ء ص ۲۰۹۔ [3] شیخ حسام الدین (مترجم) "انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ" اشاعت دوم ۱۹۴۷ء ص ۱۱۔

تحریکِ آزادی کا سفر

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے آزادیِ ہند تک

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے منتقل ہو کر براہِ راست حکومتِ برطانیہ کے زیرِ نگیں آگئی۔ ادھر انگریزوں کی انتقامی کارروائی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ مسلمان بالخصوص انگریزوں کے مظالم کا شکار بنے۔ ہندوستانیوں نے بھی اپنے ملک کو آزاد کرانیکا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ ایک طرف سیاسی سطح پر عوام کا استحصال، دوسری طرف اس جبر و تشدد اور استبداد کے خلاف عوام کے دلوں میں سلگتی ہوئی غم و غصہ کی آگ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام اور حکومت کے مابین کشیدگی روز بروز بڑھتی رہی۔ اس صورت حال کے پیش نظر انگریزوں کو ایک ایسی انجمن بنانے کی فکر ہوئی جس سے عوام اور حکومت کے درمیان رابطہ قائم ہو سکے اور حکومت کے خلاف عوام کے دلوں میں پنپتی ہوئی مخالفت کا مناسب طریقے سے سدِ باب کیا جا سکے لہٰذا ایک ریٹائرڈ افسر اے۔ او ہیوم نے ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ڈفرن کی تجویز وایما پر ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کا خیال تو پہلے ہی چند سربرآوردہ انگریزوں کے ذہنوں میں آیا تھا لیکن اس کی باضابطہ طور پر تشکیل ۱۸۸۵ء میں عمل میں آئی۔ انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی میں ڈبلو سی بینرجی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے مختلف اطراف سے آئے ہوئے بہتر نمائندوں نے شرکت کی۔

تواریخ کانگریس کا مصنف "انڈین نیشنل کانگریس" کے پہلے اجلاس کے بارے میں لکھتا ہے:۔

> "انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس تو قرار دادوں کے باعث قابلِ ذکر ہے جنہیں ہندوستان کے قومی مطالبات کی ابتدا کہا جا سکتا ہے"[1]

کانگریس کس نہج پر قائم کی گئی اور اس کا مزاج کیا تھا اس سلسلے میں سر جان کنگ لکھتا ہے:۔

---

[1] پٹابی سیتارامیہ "تواریخ کانگریس" مجازی پریس لاہور، ص ۲۸۔

"کانگریس کی تشکیل مغربی تخیل اور مغربی نمونے کے مطابق ہوئی۔ اس کا تمام نظام اور اس کی روح مغربی ہے۔ اور جن اغراض و مقاصد کا اس نے اعلان کیا ہے وہ بھی مغربی سیاسیات ہی سے ماخوذ ہے[1]۔"

لارڈ ڈفرن نے انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کی غرض وغایت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:۔

"حاکم اور محکوم دونوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ ہندوستان کے سیاستداں اصحاب سالانہ جمع ہو کر حکومت کو بتائیں کہ اس نظام میں کیا نقائص ہیں اور انہیں کس طرح رفع کیا جا سکتا ہے[2]۔"

انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ کے مطالعے سے ذہن میں یہ سوال اُبھرتے ہیں کہ اس انجمن کے قیام کا خیال ایک انگریز کے ذہن میں کیوں پیدا ہوا؟ ایک غیر ملکی کو ہندوستانیوں کے مسائل سے کیا دلچسپی تھی؟ ہیوم اس انجمن کی ترویج و ترقی میں اتنی دلچسپی اور انہماک سے کیوں حصّہ لے رہا تھا اور کانگریس کے اغراض و مقاصد کو عوام تک پہنچنے کے لئے ہندوستان کے شہروں کا دورہ کر رہا تھا؟ اور لارڈ ڈفرن ہندوستان کے سیاستداں اصحاب کو ایک پلیٹ فارم پر کیوں جمع کرنا چاہتا تھا؟

انڈین نیشنل کانگریس نہ قومی جذبہ کے تحت قائم ہوئی تھی اور نہ اسے عوام کے مسائل سے کوئی دلچسپی تھی۔ ابتداءً اس انجمن کے قیام کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستانیوں میں پھیلی ہوئی بےچینی اور ان کے باغیانہ جذبات کو سمجھا جا سکے اور کانگریس کے اجلاسوں میں انگریز ہندوستانیوں کے باغیانہ خیالات اور منصوبوں سے باخبر ہو جائیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کے توسط سے اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکیں اور ہندوستانیوں پر اپنا تسلط برقرار رکھ سکیں لیکن انگریزوں کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ آہستہ آہستہ کانگریس نے قومی انجمن کی شکل اختیار کر لی آخر میں یہی انجمن ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے انحطاط کا اور زوال کا باعث بن گئی۔

---

[1] سیاسیات ہند (ترجمہ پولیٹکل انڈیا) از سرجان کنگ، جناح برقی پریس، ص ۶۵۔ [2] اسرار احمد "مکمل تاریخ آزاد ہند فوج" جناح برقی پریس دہلی ص ۶۵۔

کانگریس کے قیام کے بعد کئی سال تک اس کے اجلاسوں میں صرف ریزولیوشن پاس ہوتے رہے اور گذارشات کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ کانگریس کے ہندوستانی رہنماؤں میں جوش اور گرمی کے آثار نظر آنے لگے۔ ان میں بیداری ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہندوستان کی قومی آزادی کی مانگ کی جانے لگی۔ اس دوران کانگریس کے اغراض و مقاصد میں بتدریج تبدیلیاں ہونے لگی تھیں۔ ۱۹۰۷ء میں کانگریس کا مقصد حسب ذیل قرار پایا:-

"انڈین نیشنل کانگریس کا مقصد عوام کی کوششوں سے سلف گورنمنٹ کے اس آئین کا حصول ہے جو برطانوی سلطنت کے دوسرے ممبران کو حاصل ہے"[1]

سر آکلینڈ کانگریس کے قیام کو انگریزوں کے مستقبل کے لئے خطرناک تصور کرتا تھا وہ کہا کرتا تھا کہ کانگریس کی تحریک قوم پرستوں اور باغیوں میں نفرت کی خلیج پیدا کر دے گی۔ اس نے کانگریس کی اہمیت کو ختم کرنے کے لئے ایک تقریر کے دوران کہا تھا:-

"کانگریس نہایت بے انصافی سے اپنے آپ کو ہندوستانی آبادی کا نمائندہ کہتی ہے"[2]

سر آکلینڈ کے مذکورہ بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک دوررس اور دانشور انسان تھا۔ اس کی پیش گوئی بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں صادق آئی۔ کیونکہ اس وقت تک کانگریس نے مکمل طور پر قومی انجمن کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اب یہ انجمن انگریزوں کی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی قومی انجمن بن چکی تھی۔ اور اس کا نصب العین یہ قرار پایا تھا:-

"انڈین نیشنل کانگریس کا بنیادی کردار نہ صرف وطن کے لئے آزادی حاصل کرنا تھا بلکہ ہندو مسلم، سکھ، عیسائی اتحاد سے ذات برادری اونچ نیچ کی تفریق ختم کر کے غریب امیر کے فرق کو مٹا کر ایک متحدہ ہندوستان حاصل کرنا تھا"[3]

---

[1] پٹابی سیتارامیہ "تواریخ کانگریس" ص ۱۹۔
[2] ص ۱۱۳۔
[3] خان عبدالودود خان "تحریک آزادی و یک جہتی" اشاعت اول ۱۹۸۳ء ص ۔ ۱۵۔

دوسری گول میز کانفرنس (۱۹۳۱ء) کے موقع پر کانگریس کے سلسلے میں گاندھی جی نے اپنی تقریر کے دوران جو کچھ کہا تھا اس تقریر کا ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

"...... کانگریس ان بے زبان، مفلس اور فاقہ کش لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں سات لاکھ دیہاتوں میں آباد ہیں۔ اور اس بات سے قطع نظر کہ وہ کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور آیا وہ برطانوی ہندوستان کے باشندے ہیں یا ریاستوں کے۔ ان کی حفاظت کو کانگریس ہر طرح پیش نظر رکھے گی۔ اور اگر میں یہ کہوں تو کوئی مبالغہ تصور نہیں ہوگا کہ کانگریس ان بے زبان اور فاقہ مست لوگوں کی خاطر ہر ممکن قربانی کرے گی اس لئے یہ کسانوں اور غریبوں کی جماعت کہی جا سکتی ہے[1]"

کانگریس کو مضبوط اور استوار بنانے میں جن عمائدین ملک نے اہم اور موثر کردار ادا کیا ہے ان میں دادا بھائی نوروجی، آنند چارلو، ڈی۔ ای۔ واچھا، جی۔ کے گوکھلے، بدرالدین طیب جی، حسن امام، جسٹس کاشی ناتھ، ڈبلیو۔ سی بینرجی، لوک مانیہ تلک، سریندر ناتھ بینرجی، پنڈت مدن موہن مالویہ، لالہ لاجپت رائے، سر فیروز مہتہ، آنند موہن بوس، مولوی مظہر الحق، اجودھیا ناتھ، راجہ رام پال سنگھ، کالی چرن بنرجی، نواب سید محمد بہادر، امبیکا چرن موزمدار، بھوپندر ناتھ باسو، پنڈت بشن نارائن دھر، رمیش چندر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، اور گاندھی جی وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں کانگریس میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے ۱۹۰۶ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تو اس موقع پر کانگریس میں انتہا پسندی کا ایک طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم کی ابتدا تک کانگریس کی پالیسی معتدل تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا کانگریس کی پالیسی میں تبدیلیاں آتی گئیں ۱۹۱۷ء میں کانگریس پر انتہا پسندوں کا تسلط ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی افریقہ سے ہندوستان آئے تھے اور انہوں نے آزادی کی تحریکوں میں باضابطہ حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جب امرتسر میں پنڈت موتی لال نہرو کے

---

[1] پٹابی سیتارامیہ "تواریخ کانگریس" ص ۳۶۔

زیرِ صدارت کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا۔ گذارشات اور عرض داشتوں کی جگہ قومی مطالبات نے لے لی۔ اسی سال کانگریس کا نصب العین "سوراج" قرار دیا گیا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں صدر کی حیثیت سے مسٹر سی۔ آر۔ داس نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا تھا:

"ہمارا نصب العین سب سے پہلے نیشنلزم ہے۔ ایک ایسا عمل جس کے ذریعے قوم کی ہستی کا اظہار ہوتا ہے اور ہندوستانی قوم کی حقیقی ترقی سوراج کی منزل سے وابستہ ہے۔ اس لئے ہندوستان کے تمام مسائل کا حل آج سوراج کا حصول ہے۔"[1]

تقسیمِ بنگال

بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی عوام کا شعور پورے طور پر بیدار ہو چکا تھا۔ نئی نئی تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ لارڈ کرزن جو ۳۰ دسمبر ۱۸۹۸ء میں ہندوستان کا وائسرائے بن کر آیا تھا۔ اس نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو بنگال کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ تقسیمِ بنگال کی کارروائی کے سبب ہندوستان میں اچھی خاصی شورش پیدا ہو گئی اور ہندوستان کے عوام صوبہ بنگال کی تقسیم کے مسئلے پر صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:-

"۱۹۰۵ء کا سال ایک ناقابل تسکین المیہ کا سال تھا۔ وہ شدید حادثہ بنگال کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا تھا۔"[2]

مُسلم لیگ کا قیام

یہی وہ دور تھا جب "مسلم لیگ" کے قیام کا شعور پیدا ہوا۔ اور "ہندو مہاسبھا" اسی سال معرضِ وجود میں آئی۔ ۹ نومبر ۱۹۰۶ء کو نواب سلیم اللہ خاں بہادر ڈھاکہ نے ایک تحریر جاری کی جس میں تجویز کیا گیا کہ مسلم انڈیا کنفیڈریٹنسی MUSLIM INDIA CONFRONTANCY کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی جائے۔ اس جماعت کے اغراض و مقاصد اور مجوزہ کاموں کا خاکہ بنا کر بزرگانِ قوم کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور مشوروں کے لئے دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں جمع ہونے کی دعوت دی گئی۔ اس کے ساتھ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کو بھی سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس موقع پر ہندوستان کے تمام مسلم سیاسی رہنماؤں کا اجتماع ہوا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو نواب وقار الملک کی صدارت میں ایک جلسہ

---

[1] حسین علوی "کاروانِ آزادی" ص ۱۰۔ [2] تاراچند "تاریخ تحریک آزادیٔ ہند" مترجمہ عدیل عباس جلد سوم اشاعت ۱۹۸۴ء ص ۴۴۹۔

منعقد ہوا جس میں "آل انڈیا مسلم لیگ" کا قیام عمل میں آیا۔ نواب وقار الملک سیکریٹری اور نواب محسن الملک جوائنٹ سیکریٹری مقرر کئے گئے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد ۱۹۰۷ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس موقع پر جن سیاسی شخصیتوں نے شرکت کی ان میں نثار احمد خاں، حسین شہید سہروردی، عبدالرحمن صدیقی، مولانا محمد علی، سید غلام حسنین، غازی عبدالعزیز، مولانا شوکت علی، سید بقار الحسن، فضل محمد علی خاں، شیخ عبداللہ، عبدالمجید، سید نبی اللہ، عبدالسلام رفیقی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، نواب محمد علی، راجہ نوشاد علی، نواب سر سلیم اللہ خاں، شرف الدین، نواب محسن الملک، سید رفیع الدین احمد، مولانا مظہر علی خاں، خورشید سید جی، عبدالکریم، ظہور احمد، شاہ مصطفےٰ، وزیر حسن، شمشاد احمد خاں، محمد یوسف، چودھری غلام مصطفےٰ، نواب سید نواب علی، محمد علی جسٹس شاہ دین وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پہلی جنگ عظیم

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ہندوستانیوں نے اس جنگ میں انگریزوں کی بھرپور اعانت کی اور کمک پہنچائی۔ تقریباً دس لاکھ ہندوستانی برطانیہ کی طرف سے لڑنے کے لئے گئے۔ انہوں نے فرانس سے مشرقی افریقہ تک اپنی بہادری اور وفاداری کے جوہر دکھائے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں سے وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے خاتمہ پر وہ ان کے جائز حقوق دیدیں گے۔ لیکن ۱۹۱۸ء میں جب جنگ عظیم ختم ہوئی تو انگریز اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے۔ مزید بر آں ہندوستانیوں پر سخت ترین قوانین نافذ کئے گئے اور شدت کے ساتھ حریت پسندوں کو کچلنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ ادھر ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں ایک ساتھ ہوئے۔

رولٹ ایکٹ

۱۹۱۷ء کے اواخر میں مسٹر جسٹس اے رولٹ کی قیادت میں رولٹ ایکٹ کمیٹی قائم ہو گئی۔ اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ اندرون ملک حکومت کے خلاف ہونے والی "سازشوں" کی تحقیقات کرے اور ان کا انسداد بھی۔ اس ضمن میں اپریل ۱۹۱۸ء کو رولٹ ایکٹ کمیٹی کے تحت ایک رپورٹ پیش کی گئی اور ہندوستانی عوام کی تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگادی گئی۔ رولٹ ایکٹ کا واضح مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی عمائدین اور عوام کو گرفتار کر کے تحریک کو دبا دیا جائے جس سے وہ آگے سر نہ اٹھا سکیں، لیکن اس کا رد عمل یہ ہوا کہ ہندوستان کے عوام

اور بھی سرگرم ہو گئے۔ مسٹر جناح اور گاندھی جی نے اس ایکٹ کی شدت سے مخالفت کی۔

ستیہ گرہ کی تحریک

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ اگر حکومت کا یہی طریقہ رہا تو ہم ستیہ گرہ کی پالیسی اپنانے پر مجبور ہو جائیں گے۔

لیکن حکومت کے رویئے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ گاندھی جی نے مجبور ہو کر رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر دی۔ اور ایک حلف نامے کے تحت کہا:۔

"ستیہ گرہ یہ حلف اٹھاتا ہے کہ اگر رولٹ ایکٹ منظور کر لیا گیا اور اسے قانون کی صورت دیدی گئی تو وہ ان قوانین کی پابندی نہیں کریگا تا وقتیکہ قوانین واپس نہ لے لئے جائیں[1]"

رولٹ ایکٹ کی ہندوستانیوں نے شدت سے مخالفت کی "جدوجہد آزادی" کا مصنف لکھتا ہے:۔

"جب گاندھی جی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو انہوں نے ستیہ گرہ کے ذریعے ان کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ تحریک نہ مقامی تھی اور نہ اس کے مقاصد محدود تھے۔ انہوں نے ایک ستیہ گرہ سبھا قائم کی اور ان ظالمانہ قوانین کی پابندی نہ کرنے کا ایک عہد نامہ تیار کیا۔ ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو ملک گیر ہڑتال کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد سول نافرمانی کی نوبت آنی تھی۔ ہڑتال کی کامیابی بے مثال تھی[2]"

گاندھی جی کی اس مہم کا حکومت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ نتیجتاً ملک میں توڑ پھوڑ اور ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں احتجاجی جلسے منعقد ہوئے۔ بمبئی، احمد آباد اور لاہور میں جہاں تہاں عمارتوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو، گاندھی اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۳ دسمبر کو فیض آباد، (یوپی) میں پولیٹیکل کانفرنس کے اجلاس میں پنڈت نہرو نے پچاس ہزار سے زائد کسانوں کے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"انفرادی طور پر بھوک ہڑتال کرنے اور چھوٹے چھوٹے معاملات پر ستیہ گرہ کرنے کو ہم روا رکھیں گے۔ ستیہ گرہ کا ہتھیار ضروری قومی مقاصد کے لئے مقصود ہے۔ میں نے

---

[1] صلاح الدین ناسک "تحریک آزادی" پنجاب آرٹ پریس لاہور ص ۲۱۱۔ [2] "جدوجہد آزادی" از بپن چند ، الملیش تر پاٹھی ، بردن ڈے ۔ مترجمہ غلام ربانی تاباں ، اشاعت ۱۹۷۲ء ص ۱۲۱۔

اخبارات میں پڑھا ہے کہ مسلم لیگ نے "ستیہ گرہ" کے اصول کے حق میں فیصلہ کیا ہے۔ تاہم یہ ایک اچھی علامت ہے۔ لیگ نے سیاسی طور پر۔۔۔ ایک بار بھی کانگریس کی تقلید کی۔ ہمیں ملک میں آزادی کی جدوجہد کے لئے تیار ہونا چاہیئے۔ تمہیں آزادی ابھی تک نہیں ملی۔ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ ایک بہادر گڈھوالی پچھلے ساڑھے آٹھ سال سے جیل میں محبوس ہے اور ابھی تک اسے رہا نہیں کیا گیا۔[1]

ہوم رول لیگ

ہندوستان کی جنگ آزادی میں ایک ایسی خاتون کا نام ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ لیا جائے گا جو ہندوستانی نہ ہوتے ہوئے بھی جنگ آزادی میں برابر شریک تھی۔ جس نے ہندوستانی مجاہدین کی آواز میں آواز ملا کر جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ اس خاتون کا نام اینی بیسنٹ تھا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں اینی بیسنٹ کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے "نیو انڈیا" کے نام سے ایک روزنامہ بھی جاری کیا تھا۔ اس خاتون کے دل میں ہندوستان کو آزاد کرانے کا جذبہ تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کیلئے اینی بیسنٹ نے ۱۹۱۶ء میں مدراس میں ہوم رول لیگ کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی۔ جس میں ہندو، مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے۔ اینی بیسنٹ نے انگریزوں کے خلاف تقریریں کرنا شروع کر دیں۔ اینی بیسنٹ کے اس باغیانہ رویہ کو دیکھ کر ۱۹۱۷ء میں انگریزوں نے انھیں نظر بند کر دیا۔

ڈاکٹر راجندر پرساد اپنی خود نوشت سوانح "اپنی کہانی" میں "ہوم رول لیگ" کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"ڈاکٹر اینی بیسنٹ نے ہوم رول لیگ قائم کر کے سارے ملک میں بڑی ہلچل مچادی۔ تقریباً سبھی صوبوں میں اس کی شاخیں قائم ہو گئی تھیں۔ سرکار اس سے گھبرا گئی تھی تو اس نے ڈاکٹر اینی بیسنٹ کو ان کے دو ساتھیوں کے ساتھ نظر بند کر دیا۔"[2]

---

[1] اخبار مدینہ جنوری ۱۹۳۹ء ص ۱۱ جلد ۲۸۔ [2] راجندر پرساد "اپنی کہانی" (مترجمہ گوپی ناتھ امن) ص ۲۰۳

تحریکِ خلافت

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۸ء کو ختم ہوئی اور ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کا آغاز ہوا۔ تحریکِ آزادی کی تاریخ میں خلافت تحریک نے بڑا اہم اور موثر کردار ادا کیا۔ خلافت کمیٹی کا قیام جولائی ۱۹۱۹ء کو عمل میں آیا اور خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت فضل الحق نے کی۔ اس کانفرنس میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ اور گاندھی جی بھی شریک ہوئے۔ اس دور میں مختلف سیاسی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ متعدد سیاسی رہنما جیلوں میں تھے۔ مولانا محمد علی جوہر جب جیل سے واپس آئے تو انہوں نے ۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی قائم کی۔ تاکہ اس سیاسی تحریک کے ذریعے انگریزوں کی منتقمانہ اور سفاکانہ پالیسیوں کو بے نقاب کیا جا سکے۔ مسلمانوں نے اس تحریک میں دلچسپی سے حصہ لیا۔ خلافت تحریک کانگریس کا ایک اہم حصہ بن گئی۔ محمد علی، شوکت علی اور دیگر سیاسی رہنماؤں نے خلافت تحریک کے پلیٹ فارم سے اثر انگیز تقریریں کیں۔ اس تحریک میں جن سیاسی رہنماؤں نے ایک مؤثر کردار ادا کیا ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا حسین احمد مدنی، غیاث اللہ فرنگی محلی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی، ظفر الملک علوی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا حسرت موہانی، مظہر الحق خاں وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ گاندھی جی نے بھی تحریک خلافت میں بڑی دلچسپی و انہماک سے کام کیا تھا۔ قاضی عدیل عباسی "تحریک خلافت" میں لکھتے ہیں:۔

"تحریکِ خلافت سے ہمارے ملک میں آزادیِ کامل کی بنیاد پڑی، اور ہندو مسلم اتحاد کا بیج بو دیا گیا۔ تحریک خلافت ایک مشعل تھی جس نے ہندوستان کے ضمیر کو روشن کیا اور اس اُجالے میں اس نے اپنے آپ کو دیکھا اور پا لیا۔"[1]

حادثہ جلیانوالہ باغ

پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ انگریز یہ بخوبی جانتے تھے کہ ہندوستان کے عوام اپنے جائز حقوق کی مانگ کریں گے لہٰذا انگریزوں نے اس کے انسداد کے لئے "رولٹ ایکٹ" کے نام سے ایک بل پاس کیا جس کی رو سے ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور انہیں سخت ترین سزائیں دی گئیں۔ اس سلسلے میں

---

[1] قاضی عدیل عباسی "تحریک خلافت" اشاعت ۱۹۷۸ء ص ۱۹۔

ہندوستانی رہنماؤں نے برطانوی سرکار کی سفاکانہ پالیسیوں کے خلاف ۱۲ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ امرتسر میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ جلیانوالہ باغ عمارتوں سے محصور ایک کھلا ہوا احاطہ تھا جس میں ایک تنگ راستہ تھا جہاں سے ایک مسلح کار بھی نہیں گزر سکتی تھی۔ اس احاطہ میں مختلف لوگوں کے اندازے کے مطابق تقریباً پچاس ہزار لوگ جمع تھے۔ لوگ پُرامن طریقے سے اپنے رہنماؤں کی تقریریں سن رہے تھے۔ جنرل ڈائر اور اس کے ساتھی صدر دروازہ سے داخل ہوئے۔ جنرل ڈائر نے فوراً اپنی فوج کی صفیں باندھ کر باغ کا محاصرہ کر لیا۔ ڈائر کے حکم پر انگریز سپاہیوں نے اندھا دھند گولیاں چلائیں۔ ہزاروں ہندو مسلمان اور سکھ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ہزاروں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے۔ جنرل ڈائر کے بہیمانہ رویے نے ہندوستانیوں کے دلوں میں انتقام کا جذبہ پیدا کر دیا۔

انڈین نیشنل کانگریس کی پنجاب سب کمیٹی کے مطابق

"جلیانوالہ باغ کا قتل عام بچوں سمیت بالکل بے قصور اور نہتے لوگوں پر ایک سوچا سمجھا وحشیانہ عمل تھا اور حالیہ برٹش حکومت کی تاریخ میں اپنی سنگ دلی میں لاثانی تھا۔"[1]

اِس حادثہ میں تقریباً دو ہزار ہندوستانی ہلاک اور کئی ہزار زخمی ہوئے۔ جلیانوالہ باغ کے خونچکاں حادثے کے سلسلے میں ۱۹۲۰ء میں ہنٹر کمیشن کی رپورٹ منظر عام پر آئی۔ یہ رپورٹ سرتاسر ہندوستانی عوام کے خلاف تھی۔ اس رپورٹ سے ہندوستانی عوام میں اشتعال پیدا ہو گیا۔

ترکِ موالات

۲۰ مئی ۱۹۲۰ء کو منعقدہ بنارس کانگریس کمیٹی کی میٹنگ میں یہ طے پایا کہ ترکِ موالات کی پالیسی اپنائی جائے۔ اِس مقصد کی تکمیل کے لئے یکم و دو جون کو مسلمانوں کا ایک جلسہ الٰہ آباد میں منعقد ہوا اور ترکِ موالات کی پالیسی کو باضابطہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ اور تحریک کو عملی جامہ پہنانے کی مساعی کی جانے لگیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، محمد علی، شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، حسرت موہانی اور حاجی احمد صدیق جیسے سیاسی رہنماؤں نے بھی اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ میں یہ تحریک خاص اہمیت

(1) REPORT OF PUNJAB SUB COMMISSION APPOINTED BY THE PUNJAB SUB COMMITTEE OF THE INDIAN NATIONAL CONGRESS.

رکھتی ہے۔ اس تحریک میں ہندوستانیوں نے بھرپور دلچسپی لی اور انگریزوں سے عدم تعاون کیا۔

تحریک عدم تعاون

۱۹۲۱ء میں کانگریس کا اجلاس احمد آباد میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت کے فرائض سی۔ آر۔ داس کو انجام دینے تھے انگریزوں نے انہیں اجلاس سے قبل ہی گرفتار کر لیا۔ چنانچہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے اس اجلاس کی صدارت کی اور خطبۂ صدارت میں فرمایا:۔

"عدم تعاون کی روح عام ملک پر طاری ہے اس براعظم کے دور دراز گوشوں میں کوئی بھی دل ایسا نہیں جو سوراج حاصل کرنے اور خلافت و پنجاب کی دست درازیوں کی دادرسی کے لئے ہنسی خوشی مصائب جھیلنے کے جذبے سے لبریز نہ ہو۔"[1]

عدم تعاون کی تحریک جولائی ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس تحریک نے برطانوی حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور سرعت سے ملک میں چاروں طرف پھیل گئی۔ اس تحریک پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے حسین علوی "کاروانِ آزادی" میں لکھتے ہیں:۔

"عدم تعاون و عدم تشدد محض ہندوستانی تحریک نہیں رہی بلکہ یہ بڑی تیزی سے ایشیائی تحریک بن گئی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب دنیا والے جھوٹ اور ناانصافیوں کے خلاف اسے عالمگیر ہتھیار کے طور پر اپنا لیں گے۔ تحریک عدم تعاون کی کامیابی سے کون انکار کر سکتا ہے؟ ہمارے کارکن بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہیں کر رہے ہیں، اپنے لبوں پر مسکراہٹ کے ساتھ دن بہ دن زیادہ تعداد میں جیلوں کا رُخ کر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ خوبیوں کی بات یہ ہے کہ حکومت کے بے پناہ جبر کے باوجود کہیں بھی جواب میں تشدد پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس جبر نے قومی عزم کو اور پختہ کرنے کا کام کیا ہے۔ جمعیۃ العلماء کے فتوؤں کی ضبطی، مقدمات کراچی، قانون اجلاس باغیانہ، کریمنل اور امنڈمنٹ ایکٹ، ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۴۴ ان سب کا صرف ایک ہی نتیجہ نکلا ہے کہ لوگوں میں اپنی قومی جدوجہد کو جاری رکھنے اور اپنے مطالبات پر ڈٹے رہنے کا عزم اور بھی

---

[1] حسین علوی "کاروانِ آزادی" ص ۵۰۶۔

پختہ ہوگیا۔[1]

عدمِ تعاون کی تحریک میں ملک کے ہر طبقہ کے افراد نے دلچسپی سے حصہ لیا۔ عدالتوں، اسکولوں، کالجوں اور تمام اداروں سے عدم تعاون کیا گیا۔ اسکولوں کالجوں کی سطح پر طلبہ نے انگریزوں کا بائیکاٹ کیا۔ انگریزی مال کا استعمال بند کر دیا۔ ڈاکٹر تاراچند "تاریخ تحریک آزادی" میں لکھتے ہیں:۔

"ملک ایک زبردست ہلچل سے دوچار ہوا اور جوش وخروش کی عدیم المثال لہر ہندوستان کے کروڑوں افراد میں پھیل گئی۔ ہر طرف جوش، مقصد میں لگن، قربانی کے لاثانی مناظر دیکھنے میں آئے۔ امتیازی حیثیتوں کے وکلاء جیسے موتی لال نہرو، سی آر داس، راجیندر پرساد، راج گوپال آچاریہ، نے اپنے اپنے منفعت بخش پیشوں کو ترک کر دیا۔ ہزاروں طلباء اپنے اپنے اسکول اور کالجوں سے باہر نکل آئے جواہر لال نہرو نے الٰہ آباد ہائی کورٹ کو الوداع کہا اور عدم تعاون کے بھنور میں پہنچ آئے۔"[2]

سائمن کمیشن

۱۹۲۷ء میں برطانوی پارلیمان نے ایک کمیشن مقرر کیا۔ جس کے چیئرمین سر جان سائمن تھے۔ مقصد یہ تھا کہ یہ کمیشن صوبوں میں حکومت کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کرے۔ ۱۹۲۷ء میں جب سائمن کمیشن ہندوستان آیا تو پورے ملک میں کمیشن کا بائیکاٹ کیا گیا۔ احتجاجی جلسے ہوئے اور ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کمیشن کے ہندوستان میں آنے کا مقصد محض یہ تھا کہ فرقہ وارانہ ہنگاموں کی آڑ میں ہندوستانیوں کو بدنام کرے۔ ہندوستانی، کمیشن کی چال سمجھ گئے اور انہوں نے متحد ہو کر کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ بمبئی میں عوام کی قیادت محمد علی جناح کر رہے تھے۔ ادھر لالہ لاجپت رائے بھی احتجاج میں شامل تھے۔ ایک احتجاجی جلوس میں لالہ لاجپت رائے پر لاٹھیاں برسائیں گئیں جس کے نتیجے میں اُن کی موت واقع ہوگئی۔

سول نافرمانی

آزادی کے سلسلے میں چلائی جانے والی مختلف تحریکوں کو مسلسل مقبولیت سے

[1] حسین علوی "کاروانِ آزادی" ص ۵۰۶ ۔ [2] از تاراچند "تاریخ تحریک آزادی" مترجمہ عدیل عباسی ص ۱۱۲

ہندوستانیوں کے حوصلے بلند ہوتے رہے۔ ان کے عزائم میں پختگی پیدا ہوگئی اور ہندوستان کے عوام نے ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی CIVIL DISOBEDIENCE کی تحریک شروع کردی، اس تحریک کو بھی پُرامن طریقے سے شروع کیا گیا۔ ہندوستان کے عوام نے بلا امتیاز مذہب وملت اس میں بھرپور حصّہ لیا۔ کسی بھی تحریک کے جاری ہوتے ہی کامیابی کی طرف قدم بڑھنے لگتے تھے۔ عوام کے جذبے اور جوش کو دیکھ کر انگریز خائف تھے۔ انگریزوں کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ ہندوستان میں اب زیادہ دنوں تک اقتدار قائم نہیں رہ سکتا۔ ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، پنڈت نہرو، ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہ مقتدر لیڈران کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان سیاسی رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد تحریک تو مدھم پڑ گئی لیکن آزادی کے تئیں محبانِ وطن کے جذبات میں مزید اضافہ ہوگیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی کتاب "تحریکِ آزادی" میں لکھتے ہیں:-

"ہم نے آزادی اور حق طلبی کی جنگ میں "نان وائلنس" "نان کوآپریشن" کی راہ اختیار کی ہے۔ ہمارے مقابلے میں طاقت اپنے تمام جبر وتشدد اور خون ریز وسائل کے ساتھ کھڑی ہے، لیکن ہمارا اعتماد صرف خدا پر ہے اور اپنی غیر مختتم قربانی اور غیر متزلزل استقامت پر، مہاتما گاندھی کی طرح میرا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ کسی حال میں ہتھیار کا مقابلہ ہتھیار سے نہ کرنا چاہئیے۔ اسلام نے جن حالتوں میں اس کی اجازت دی ہے میں اسے فطرت اور عدل واخلاق کے مطابق پیش کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی اور موجودہ جدوجہد کے لئے مہاتما گاندھی کے دلائل سے متفق ہوں، اور ان کے دلائل کی سچائی پر پورا یقین رکھتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہندوستان نان وائلینس جدوجہد کے ذریعے فتح مند ہوگا اور اس کی اخلاقی وایمانی طاقت کی ایک یادگار مثال ہوگی"[1]

۱۹۲۸ء میں کانگریس، حکومت سے نوآبادیاتی حکومت کے سلسلے میں گفت وشنید کررہی تھی لیکن حکومت، نوآبادتی حکومت کو ماننے پر آمادہ نہیں تھی۔ ہندوستانیوں نے فیصلہ کرلیا کہ اگر حکومت ہندوستان کو نوآبادیاتی حکومت کا درجہ مل جاتا ہے تو ہم تمام سیاسی سرگرمیاں واپس لے لیں گے۔ لیکن حکومتِ برطانیہ ہندوستانیوں کو کچھ دینا نہیں چاہتی تھی لہٰذا ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کانگریس کے اجلاس میں یہ قرارداد پاس ہوئی۔

---

[1] ابوالکلام آزاد "تحریک آزادی" ص ۴۳۔

"برطانوی حکومت نے ایک سال کے عرصہ میں ہندوستان کو درجۂ نوآدیاتی نہ دیا تو آئندہ کانگریس "مکمل آزادی" کو اپنا نصب العین قرار دے دیگی"[1]

انگریزوں نے اس قرارداد کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنی پالیسیوں پر عمل پیرا رہے۔ لہٰذا ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور کانگریس کے اجلاس میں رات کے ٹھیک بارہ بجے مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس ہوگیا۔ یہ ریزولیوشن انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ میں ایک اہم قدم تھا۔ ریزولیوشن پاس ہونے کے بعد ہندوستان کے عمائدین سیاست اسے عملی جامہ پہناتے میں منہمک ہوئے۔ کروڑوں عوام نے ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو پورے ملک میں آزادی حاصل کرنے کا حلف اٹھایا، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے :۔

"برطانوی حکومت نے ہندوستانی عوام کو نہ صرف آزادی سے محروم کردیا ہے بلکہ ہندوستانیوں کو ہر حیثیت سے تباہ کردیا ہے۔ اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندوستان برطانیہ سے قطع تعلق کرلے اور کامل آزادی حاصل کرکے رہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تشدد ہمارے لئے آزادی حاصل کرنے کا مؤثر ذریعہ نہیں ہے۔ اس لئے ہم عدم تشدد کے اصول پر عمل کرتے ہوئے حکومت سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ سول نافرمانی کی تیاری کریں گے، جس میں محصول کا ادا نہ کرنا بھی شامل ہوگا۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم حکومت کو کسی قسم کی امداد نہ دیں اور خواہ کتنا ہی اشتعال دلایا جائے تشدد سے ہرگز کام نہ لیں تو اس ظالمانہ حکومت کا پندرہ روز میں خاتمہ ہوجائے گا۔ لہٰذا ہم صدقِ دل سے عہد کرتے ہیں کہ کانگریس ہم کو جو بھی ہدایت دے گی ہم اس پر عمل کریں گے۔ اور حصول آزادی کے لئے ہر قسم کی قربانیاں دیں گے۔"[2]

ہندوستانی اپنے عزائم پر عمل پیرا رہے۔ ادھر گاندھی جی نے قانون نمک سازی کے خلاف تحریک شروع کردی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی اٹھتر لوگوں کے ساتھ سابرمتی آشرم کیلئے روانہ ہوگئے اور گجرات کے دیہی علاقوں میں دو سو میل کا سفر کرکے ڈانڈی پہنچے جو ساحل سمندر پر

---

[1][2] شوکت علی فہمی "انقلاب کی خونریز داستان" خواجہ پریس دہلی ص ۱۷۰، ۱۷۱۔

واقع ہے۔ نمک قانون سازی کے خلاف ملک میں تقریباً ایک لاکھ عوام نے گرفتاریاں دیں۔

کانگریس کی مقبولیت اور اس کی چلائی ہوئی تحریکوں کی مسلسل کامیابی کو دیکھ کر برطانوی حکومت کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ حکومت نے جدید اصلاحات کے بارے میں غور و خوض کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں لندن میں مسلسل ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء میں تین گول میز کانفرنسیں منعقد ہوئیں اس کے باوجود کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت ہندوستانی ریاستوں کو خود مختاری کے حقوق حاصل ہو گئے اس طرح ہندوستانیوں کو مرکز میں بھی نمائندگی ملنے لگی۔

دوسری جنگ عظیم

۱ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ ادھر برطانیہ نے بھی جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ ہندوستان کے سیاسی حالات خراب ہونے لگے۔ اس صورتِ حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک خصوصی اجلاس منعقد کیا گیا۔ اس اجلاس میں یہ نتیجہ نکالا گیا کہ انگریز اس طرح اپنے اغراض و مقاصد حل کرتے رہیں گے۔

ہندوستان چھوڑو تحریک

صورتِ حال پر غور و خوض کرنے اور آئندہ لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے ۱۹۴۲ء میں بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا اس اجلاس میں "ہندوستان چھوڑو تحریک" QUIT INDIA MOVEMENT کا ریزولیوشن پاس کر دیا گیا۔ اس ریزولیوشن کے پاس ہوتے ہی انگریزوں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو گرفتار کر لیا گیا اور پوری طرح اس تحریک کو ناکام کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ "ہندوستان چھوڑو تحریک" ملک گیر سطح پر شروع ہو گئی کیونکہ عوام مقتدر لیڈروں کی گرفتاری سے مشتعل ہو گئے۔ ملک میں توڑ پھوڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سیاسی رہنما اس تباہ کن پالیسی کے خلاف تھے لیکن عوام کے جذبات کو نہ روک سکے۔ ادھر انگریزوں کے انتقام کی آگ اور تیز ہو گئی اور اندھا دھند گرفتاریاں کرنے لگے۔

آزاد ہند فوج

یہی وہ زمانہ تھا جب نیتاجی سبھاش چندر بوس کے دل میں "آزاد ہند فوج" کے قیام کا خیال پیدا ہوا اور ۲۶ جنوری ۱۹۴۲ء کو انہوں

نے جرمنی میں پندرہ سو ہندوستانیوں پر مشتمل "آزاد ہند فوج" کی تشکیل کی۔ آہستہ آہستہ فوج کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس میں جنرل شاہ نواز، جمیل خاں، لیفٹیننٹ ضمیر الحق، میجر گورکھ سنگھ وغیرہ شامل تھے۔ سبھاش چندر بوس نے اس دور کی سیاسی صورتِ حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے برلن ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا۔

"آج جبکہ برطانوی سلطنت معدوم ہونے کو ہے تو ہندوستان کی آزادی کا سورج طلوع ہونے کو ہے۔ میں آپکو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان نے ۱۸۵۷ء میں اپنی آزادی کی پہلی لڑائی لڑی تھی اور ۱۹۴۲ء میں اس نے اپنی آزادی کی آخری جنگ کا آغاز کر دیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی دیوی تمہاری منتظر ہے۔ اُٹھو! اور آگے بڑھو۔ فتح و نصرت تمہارے قدم چومنے کو بیتاب ہے۔ تمہارا منتہائے مقصود ہے "آزاد ہند" اس کے لئے تمہیں اپنی عزیز جانوں کی قربانی دینی ہے۔ نئے آزاد ہند کی تعمیر کرنا ہے جس میں کسی بیرونی طاقت کا عمل دخل نہ ہو، پوری آزادی ہو، جس میں ہر ہندوستانی کو اپنا مستقبل بنانے کی پوری آزادی ہو۔ "آزاد ہند فوج" کی بنیاد ایسے مجلسی نظام پر رکھی جائے گی جو انصاف، مساوات، اور اخوت کے پرانے اصولوں پر مبنی ہو۔"[1]

اس سیاسی صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے گاندھی جی نے کہا:۔

"میری تجویز کے مطابق انگریزوں کو بہت جلد ہندوستان چھوڑ دینا پڑیگا جسے آجکل انارکی اور طوائف الملوکی کہا جاتا ہے ممکن ہے وہ اس انارکی کی بدولت کچھ عرصہ تک باغی جنگ و جدل یا لوٹ مار ہوتی رہے۔ اس عارضہ طوائف الملوکی کو موجودہ ذلت آمیز سامراج پر ترجیح دینی چاہیئے"[2]

ہندوستان میں انگریزی حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ ہندوستان کے عوام اور سیاسی رہنماؤں کو اپنے خواب تعبیر آشنا ہوتے نظر آنے لگے اور انگریزوں کے پیر ہندوستان سے

---

[1] امداد صابری "سبھاش بابو کی تقریریں" ص ۲۱۔ [2] دھرم پال "تحریک ۱۹۴۲" گیلانی پریس لاہور ص ۵۱۔

اکھڑنے لگے۔ اس صورت حال میں ۲۱ر فروری ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کر دیا گیا۔ "جدوجہد آزادی" کا مصنف لکھتا ہے :۔

"برطانیہ نے آخرکار اختیارات ہندوستان کو سونپنے کا فیصلہ کر لیا۔ تفصیلات طے کرنے کے لئے جن میں فوری اور آئندہ دونوں قسم کی تفصیلات کا فیصلہ ہونا تھا۔ ایک کیبنیٹ مشن ہندوستان بھیجا گیا۔ مختلف تنظیمیں اور پارٹیوں کے رہنماؤں سے طویل اور تفصیلی گفتگو کے بعد کیبنیٹ مشن نے اپنے منصوبے کا اعلان کر دیا جس کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے منظور کر لیا۔ لیکن بعد میں ان تجاویز کی توضیح میں اختلافات رونما ہو گئے۔ لیکن ویول کی خواہش تھی کہ درمیانی مدت کی حکومت جلد اختیارات سنبھال لے۔ ستمبر ۱۹۴۶ء میں کانگریس نے حکومت بنالی۔ جواہر لال نہرو مجلس وزراء کے سربراہ تھے۔ اکتوبر میں مسلم لیگ بھی کابینہ میں شامل ہو گئی لیکن انہوں نے آئین سازی کے کام میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ۲۰ ر فروری ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیرِ اعظم نے اعلان کیا کہ زیادہ سے زیادہ جون ۱۹۴۸ء تک برطانیہ ہندوستان کو اختیارات سونپ دے گا[1]"

آزادی اور ملک کی تقسیم

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اگست ۱۹۴۷ء ہی میں ہندوستان کو آزاد کرانے کے حق میں تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک مصالحتی منصوبہ تیار کیا اور اختیارات کی منتقلی کو ایک سال اور قریب تر لے آیا۔ برطانوی حکومت نے بڑے غور و خوض کے بعد مایوس ہو کر ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کو ہندوستان کی تمام جماعتوں سیاسی، لیگی اور کانگریسی رہنماؤں نے منظور کر لیا اور ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی کے ساتھ دو الگ الگ ملک ہندوستان اور پاکستان وجود میں آئے۔

---

[1] "جدوجہد آزادی" از بپن چندر، املیش ترپاٹھی، بروُن ڈے (مترجم غلام ربانی تاباں) اشاعت ۱۹۷۲ء ص ۲۰۷۔

HaSnain Sialvi

تحریکِ آزادی
اور
اردو ناول

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد ہندوستان میں مکمل طور پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا اور انگریزوں کی انتقامی کارروائی کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ جنگ کی ناکامی کے چند برس بعد سر سید احمد خان نے علی گڑھ تحریک کی ابتدا کی۔ اس تحریک میں شبلی، حالی ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک، اور ذکاءاللہ کے نام خاص طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان تمام ادیبوں اور شاعروں نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور اپنے اپنے میدانوں میں قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ حالی نے تنقید نگاری، شبلی نے تاریخ نویسی اور ڈپٹی نذیر احمد نے ناول کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ اردو میں ناول کا تصور مغرب کے اثرات سے آیا۔ اردو میں ناول نگاری کی باضابطہ ابتدا نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس" سے ہوتی ہے۔

اس باب کی ترتیب میں صرف انہیں ناولوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے جن میں سیاسی موضوعات سے بحث ملتی ہے اور آزادی کی مختلف تحریکوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ افسانوی ادب میں عموماً براہِ راست جنگِ آزادی کا بیان اور سیاسی مسائل پر اظہارِ خیال نہیں ملتا۔ البتہ الفاظ کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو اس کا احساس ہوتا ہے۔

اردو ناول نگاروں میں بھی حب الوطنی کا جذبہ اور آزادی کی تڑپ تھی۔ انہوں نے اپنے فن کی حدود میں رہتے ہوئے اس جذبے اور تڑپ کا اظہار کیا ہے۔ اور اپنے ناولوں کے وسیلے سے قومی شعور کی بیداری میں جو رول ادا کیا ہے وہ نمایاں نہ ہوتے ہوئے بھی خاص اہمیت کا حامل

ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کے سیاسی حالات و کوائف کو مدنظر رکھتے ہوئے سہیل بخاری اپنی کتاب "اُردو میں ناول نگاری" میں لکھتے ہیں :۔

"۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کا پورا تسلط ہو گیا تو ان کی معاشرت اور تہذیب نے زندگی کے ہر شعبے پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا چنانچہ اردو افسانہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اُردو داں طبقے کی عام ذہنیت کا انقلاب ڈاکٹر نذیر احمد کے ناولوں کی شکل میں رونما ہوا۔"[۱]

۱۸۵۷ء کے بعد جب علی گڑھ تحریک کا قیام عمل میں آیا تو نذیر احمد بھی اس تحریک سے وابستہ رہے۔ انہوں نے اس تحریک کے زیرِ اثر اصلاحی ناول لکھے۔ افتخار احمد صدیقی نذیر احمد کی ناول نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"مولوی نذیر احمد معاشرتی شعور سے بہرہ ور اور زندگی کے بارے میں ایک واضح نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ ان کے قصے معاشرتی زندگی کی تصویر اور تفسیر بھی ہیں اور تنقید بھی .... مولوی نذیر احمد کے رجحانات و تصورات تقریباً وہی تھے جو سید احمد خاں کے رفقار کے مخصوص افکار سمجھے جاتے ہیں۔ اصل جذبہ اور محرک قوم کی اصلاح اور ترقی کا خیال تھا اور انکے تمام قصوں میں مقصدی اور اصلاحی پہلو بہت نمایاں ہیں۔ ان کی مقصدیت ایک خاص دور کے تقاضوں اور تحریکوں سے تعلق رکھتی ہے۔"[۲]

نذیر احمد حصولِ علم کو حصولِ آزادی کے لئے ناگزیر تصور کرتے تھے۔ ان کے اس قسم کے خیالات اور نظریات ان کے ناولوں میں مل جاتے ہیں۔ "بنات النعش" میں انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے :

"ذرا انگلستان کی تاریخ پڑھو تو تم کو معلوم ہو کہ ابتدا ان لوگوں کی کیا تھی۔ نرے وحشی تھے ... رومیوں کی سلطنت تھی۔ انہیں سے انگریزوں

---

[۱] سہیل بخاری "اُردو ناول نگاری" ص ۴۵ ۔ [۲] افتخار احمد صدیقی "بحوالہ تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ" ص ۲۵۴

نے عقل و سلیقہ سیکھا یہاں تک کہ رومیوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دیا۔"[1]
نذیر احمد کا ناول "ابن الوقت" اس دور کی سیاست اور معاشرت کا آئینہ دار ہے۔ اس ناول میں انہوں نے زندگی کے مسائل اور قومی زندگی کے رجحانات سے بحث کی ہے۔

معین عقیل اپنی کتاب "تحریکِ آزادی میں اردو کا حصّہ" میں "ابن الوقت" کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> "نذیر احمد کے ناولوں میں "ابن الوقت" بہترین معاشرتی اور سیاسی ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ابن الوقت میں خانگی زندگی سے بحث کرتے ہوئے قومی زندگی کے مسائل اور رجحانات سے بحث کی ہے۔ ابن الوقت میں فصل دوم سے فصل ششم تک جنگ آزادی کے واقعات اور اس کے عواقب کا بیان نذیر احمد کے عینی مشاہدے پر مبنی ہے۔ اس کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے حکومت کی کمزوریاں اور حکام کی زیادتیاں بھی کھلے لفظوں میں بیان کی ہیں۔"[2]

غدر کے سلسلے میں "ابن الوقت" کا ایک اقتباس ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:۔

> "غدر کے چوتھے دن کا ذکر ہے کہ ابن الوقت دو گھڑی دن رہے آخری کھیپ روانہ کرنے کے بعد قلعے کی طرف چلا آرہا تھا۔ ایک آپ تھا اور دو نوکر، تینوں مسلح، اور ان دنوں جب دو آپس میں مذکور کرتے تھے تو بھی غدر کا مذکور ہوتا تھا۔ یہ لوگ بھی اس طرح کا تذکرہ کرتے چلے جاتے تھے جوں ہی محسن خاں کے کٹڑے سے آگے بڑھ کر اُس کھلے ہوئے میدان میں پہنچے جو میگزین اور کالج کے درمیان میں واقع تھا، دیکھتے کیا ہیں کہ

---

[1] نذیر احمد "بنات النعش" ص ۱۸۲۔
[2] معین عقیل "تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ" ۱۹۷۶ء ص ۵۴۷۔

کے بائیں طرف انگریزوں کی کچھ لاشیں پڑی ہیں۔ یہ دیکھ کر ابن الوقت
کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ اس وقت وہ موقع تھا کہ اکیلا کیسا ہی کوئی
سُورما کیوں نہ ہو ڈر کے مارے گھگی بندھ جاتی۔۔۔ معلوم ہوتا ہے
کہ شہر پر بڑا سخت عذاب آنے والا ہے[۱]۔

مندرجہ بالا اقتباس میں غدر کے حالات وکوائف کی جھلک نظر آتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت عوام کے دلوں میں انگریزوں کی کتنی دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔

بیسویں صدی کے اوائل میں قومی نظریات ورجحانات میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوگئیں۔ نئی نئی تحریکوں نے جنم لیا۔ تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء) مسلم لیگ کا قیام (۱۹۰۶ء) پہلی جنگ عظیم کا آغاز (۱۹۱۴ء) ہوم رول لیگ کی تحریک (۱۹۱۷ء)۔ ان سب کی بدولت یہ دور سیاسی وسماجی اعتبار سے خاصا ہنگامہ خیز تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب پریم چند نے اردو افسانہ نویسی اور ناول نگاری کے میدان میں باضابطہ قدم رکھا۔ پریم چند کا تخلیقی سفر ۱۹۰۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۶ء میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس مدت میں انہوں نے کم وبیش ایک درجن ناول تخلیق کئے جو اردو کے افسانوی ادب میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

پریم چند کا زمانہ بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس وقت سیاسی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں۔ لوگ آزادی کے گیت گا رہے تھے۔ گاندھی جی ہندوستان کے سیاسی منظرنامے میں اپنا مقام بنا رہے تھے۔ پریم چند بھی گاندھی جی کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ نتیجے کے طور پر پریم چند نے ملک وقوم کی خدمت کی غرض سے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

پریم چند اُردو کے ایک بڑے ناول نگار ہیں۔ پریم چند کے ناولوں میں محنت کش عوام، مظلوم کسانوں اور متوسط طبقے کے افراد کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وہ ایک فنکار تھے جنہوں نے سماج کا بہت قریب سے مطالعہ کیا۔ افراد کی زبوں حالی اور مصائب کو بہت قریب سے دیکھا تھا ان کی نگاہ سائنٹفک اور معروضی تھی۔ پریم چند کی تصانیف اپنے عہد کے معاشی، تہذیبی

---

[۱] نذیر احمد "ابن الوقت" ۱۹۶۲ء ص ۱۳-۱۴۔

اور بالخصوص سیاسی زندگی کی ترجمان ہیں۔

"پریم چند کی ناولوں کا مواد ہمارے خاندانی، سماجی اور سیاسی سبھی قسم کے واقعات و حالات سے فراہم کیا گیا ہے۔"[1]

آل احمد سرور پریم چند کی ناول نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"پریم چند کے ناول سماجی اور سیاسی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ ہر مسئلے پر ہمہ جہتی روشنی ڈالتے ہوئے چلتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں تاریخیت کے ساتھ ساتھ فنکاری بھی شامل رہتی ہے۔ وہ ہمیں ہمارے سماج کے ہر طبقے، ہر پیشہ اور ہر عمر کے آدمیوں، رسم و رواج، بود و باش کے طریقوں، خیال و عمل کی مختلف تحریکوں اور دیگر متعلقات حیات سے واقفیت کرا کے ہماری معلومات بڑھاتے ہیں۔ مقامی رنگ ان کے ناولوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ ہندوستان میں بیٹھ کر ایران و توران کے افسانے لکھتے ہیں۔ وہ یہیں کے ناولوں سے اپنی دکان بساتے سجاتے ہیں۔ مقامی رنگ مقامی خصوصیات ان کے یہاں اوّل سے آخر تک جھلکتی ہیں۔"[2]

پریم چند کا زمانہ سیاسی اعتبار سے بڑا ہیجان خیز تھا۔ عوام میں بڑی سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ انقلاب روس، پہلی جنگ عظیم کا خاتمہ، برطانوی اقتدار کے خلاف عوام میں بیزاری، محنت کش عوام کی زبوں حالی اور متوسط طبقہ کی بیداری، پریم چند نے ان تمام مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔

پریم چند محبِ وطن تھے۔ انہیں اپنے وطن کی ہر چیز سے بے پایاں محبت اور لگاؤ تھا۔ ان کے ناول اپنے عہد اور خصوصاً بیسویں صدی کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے بہترین ترجمان ہیں۔ پریم چند کو اپنے وطن سے عقیدت تھی۔ ان کے ناولوں میں حب الوطنی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ پریم چند گاندھی جی کے ارادت مندوں میں تھے اور گاندھی ازم میں یقین،

---

[1] سہیل بخاری "اردو ناول نگاری" ص ۷، ۹۔ [2] آل احمد سرور "تنقیدی اشارے" ص ۸۔

رکھتے تھے۔ دیا نرائن نگم اپنے ایک مضمون میں پریم چند کے تصورات کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"وہ سچے محب وطن اور کامل ادیب تھے اور فن میں کامل وہی شخص ہوسکتا ہے جس کا دل وسیع، نگاہ بلند، طبیعت بے ریا اور نیت صالح ہو۔ جو زر پرست نہ ہو بلکہ ادنیٰ و اعلیٰ ہر ایک کا ہمدرد ہو۔ ہر حال میں بے لوث رہ کر زندگی کے حقائق سے واقفیت رکھتا ہو۔"[1]

حب الوطنی پریم چند کے رگ و ریشہ میں بسی ہوئی تھی۔ عبدالماجد دریا آبادی پریم چند کی وطن دوستی کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

" لوگ قصے کہانیوں کو محض لطف و تفریح کے لئے پڑھتے ہیں لیکن اسکے لطف کے ساتھ اگر نفع بھی منظور ہو تو بدی کی مخفی راہوں کا علم، شیطنت کی چالوں کا احساس اور وطن کا صحیح جذبہ ایثار و خلوص اور خدمتِ خلق کی تربیت بھی اگر مدنظر ہو تو ایسی شیریں خوشگوار کونین پریم چند کے دواخانہ میں ہی دستیاب ہوسکتی ہے۔ اور ہندوستان میں تحریک وطنیت کی تاریخ مورخ کا قلم جب آج سے سو پچاس کے بعد لکھے گا تو اس کو تیس پینتیس سال کی تاریخ سمجھنے کے لئے جہاں گاندھی جی، موتی لال، داس، محمد علی، انصاری اور ابوالکلام آزاد کی تقریریں اور تحریریں لازمی ہوں گی وہاں پریم چند کی تحریریں بھی ناگزیر ہوں گی "[2]

پریم چند نے اپنے ناولوں میں معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی موضوعات پر قلم اٹھایا پریم چند کی ناول نگاری کے حدود کا تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر معین عقیل لکھتے ہیں :۔

" پریم چند نے بلاشبہ اپنے ناولوں میں معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں کا اس طرح احاطہ کیا ہے کہ ان کے ناول نہ صرف ایک خاص عہد کے معاشرتی اور سیاسی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ ایک

---

[1] زمانہ' کانپور "پریم چند نمبر" ص ۱۳۱۔
[2] " " ص ۱۶۱۔

خاص قوم کے مزاج اور ہیجانات کے مُبصّر بھی ہیں۔ ان کے ناول
کسی محدود اور مخصوص معاشرہ کے بجائے ہندوستان کے شہروں
اور دیہاتوں، ان مختلف طبقات اور ان کے تہذیبی، سیاسی اور
قومی مسئلوں، کشمکش اور انقلاب کے مظہر ہیں[1]۔

پریم چند نے گاندھی جی سے متاثر ہوکر اور عدم تعاون کی تحریک کے زیرِ اثر ملازمت سے استعفیٰ دیدیا اور گاندھی جی کے ساتھ آزادی کی تحریک میں اپنی تحریروں اور ناولوں کے ذریعہ حصّہ لیا۔ "گوشۂ عافیت" اور "میدانِ عمل" گاندھی جی کے نظریات و خیالات کی نمائندگی کے لئے لکھے گئے۔ بالواسطہ طور پر پریم چند نے اپنے ناولوں کے ذریعے گاندھی جی کے خیالات کو تعلیم یافتہ لوگوں تک پہنچانے میں اہم اور مؤثر کردار ادا کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پریم چند گاندھی جی کے نظریات سے براہِ راست متاثر تھے۔ وہ اپنے ایک ناول "جلوۂ ایثار" میں ایک کردار کی زبان میں کہتے ہیں:۔

"مجھے ایک بیٹا دے دیو ماتا۔
دیو ماتا نے پوچھا۔ جو بہت دھنوان ہو، بلوان ہو اور دنیا بھر میں شہرت حاصل کرے۔
لیکن ماں نے کہا، نہیں مجھے ایسا بیٹا دے جو وطن کی خدمت کرے[2]۔"

پریم چند کے ناولوں میں "گوشۂ عافیت" ایک اہم ناول ہے۔ اس ناول کا زمانہ تصنیف سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان میں عدم تعاون، سول نافرمانی، کسانوں کی بغاوت اور کمیونسٹ پارٹی کے قیام کا زمانہ تھا۔ اس ناول کا مخصوص موضوع کسانوں کی بغاوت جو انگریزی نظام کے خلاف وقتی تقاضوں کے مطابق تھی۔

پریم چند کے ناول "میدانِ عمل" میں اس دور کے ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال اور عوام میں غیر ملکیوں کے خلاف باغیانہ رجحانات کا عکس نظر آتا ہے۔ "میدانِ عمل" میں اسوقت کے ہندوستان کی سیاست اور حکمراں طبقے کے مظالم کا ذکر بھی ملتا ہے۔

---

[1] معین عقیل "تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ" ص ۵۵۸۔ [2] پریم چند "جلوۂ ایثار" ص ۱۱۰۔

اس ناول کے تمام کردار انگریزوں کے مظالم اور غیر ملکی حکومت کے بے جا تسلط کے طلب گار ہیں اور اپنے عہد کی سیاسی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سید طالب علی اپنے ایک مضمون میں "گوشۂ عافیت" کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"عدم تشدد، ترک موالات، اور ستیہ گرہ کی پوری تاریخ اس کے صفحوں میں بند کر دی گئی ہے۔ ناول کیا ہے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک کے ہندوستان کی تمام تحریکوں کی ایک پر کیف داستان ہے"۔[1]

پریم چند کا ایک اور اہم ناول "چوگان ہستی" ہے جو ۱۹۲۴ء میں تخلیق کیا گیا۔ اس کو پریم چند نے اپنا بہترین ناول قرار دیا ہے۔ یہ دو جلدوں میں ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ناول بھی اپنے عہد کی سیاسی کشمکش کا آئینہ دار ہے۔ اس میں پریم چند نے مختلف کرداروں کی زبان سے گاندھی جی کے سیاسی نظریات کی ترجمانی کی ہے۔

"چوگان ہستی" میں رانی جانہوی کا کردار بڑا اہم ہے۔ وہ اپنے لئے ایک ایسے بیٹے کی خواہش کرتی ہے جو محب وطن ہو اور ملک و قوم کی خدمت میں اپنی جان تک قربان کر دے۔ وہ ونئے کی موت پر تقریر کرتے ہوئے کہتی ہے:۔

"میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ ایشور مجھے کوئی ایسا ہی سپوت دیتا جو انہیں جانبازوں کی طرح موت سے کھیلتا جو اپنی زندگی کو ملک و قوم کی خدمت میں قربان کر دیتا"۔[2]

"چوگان ہستی" میں آزادی سے قبل کے حالات سماجی اور معاشی پہلوؤں سے بحث ملتی ہے اور گاندھی جی کی تحریکوں کی جھلک بھی اس ناول میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔

"گئودان" پریم چند کا معرکۃ الآرا ناول ہے جس نے نہ صرف اردو بلکہ پورے ہندوستانی ادب میں اپنی اہمیت اور قدر و وقعت کا لوہا منوایا ہے۔ اس میں اس دور کے سیاسی موضوعات اور مسائل سے بحث ملتی ہے۔ گئودان کے کردار، آزادی کی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں، اور اپنے وطن سے والہانہ محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ گئودان کے مندرجہ ذیل اقتباس

---

[1] "زمانہ" کانپور "پریم چند نمبر" ص ۱۹۰ ۔ [2] چوگان ہستی ص ۶۲-۲۶۳۔

میں اسی محبت اور عقیدت کی جھلک نظر آتی ہے۔

"سمری اور بیلا دونوں صوبہ اودھ کے گاؤں ہیں۔ ضلع کا نام بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہوری بیلاری میں رہتا ہے اور رائے صاحب اگرپال سنگھ سمری میں۔ دونوں گاؤں میں صرف پانچ میل کا فاصلہ ہے۔ پچھلی ستیہ گرہ کی لڑائی میں "رائے صاحب" نے بڑا نام کمایا تھا کونسل کی ممبری چھوڑ کر جیل چلے گئے تھے جبھی سے ان کے علاقے کے آسامیوں کو ان سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی"[۱]

معین عقیل "گئودان" کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"یہ ناول اپنے دور کے مختلف اقتصادی اور سیاسی انقلابات کو پیش کرتا ہے۔۔۔۔ اس کے کرداروں میں کسان، زمیندار، شہر کے باشعور افراد، قومی تحریک کے کارکن سبھی ہیں جو حکام بالا دست سے نہیں ڈرتے اور ملک کی آزادی کے کو عملاً ظاہر کرتے ہیں"[۲]

یوسف سرمست نے اپنی کتاب "بیسویں صدی میں اردو ناول" میں پریم چند کے ناول کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی ناول نگاری پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:۔

"پریم چند اپنے عہد کے سیاسی اور معاشی حالات سے براہِ راست وابستہ رہے ہیں۔ پریم چند نے ساحل سے طوفان کا نظارہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے طوفان کے تھپیڑے بھی کھائے ہیں"[۳]

پریم چند کی تصنیفات کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے بھی حامی تھے۔ انہوں نے عملی طور پر مختلف سیاسی تحریکوں میں حصہ لیا۔ پریم چند نے قلم کی تلوار سے انگریزوں کا مقابلہ کیا اور آخر تک ان کے خلاف نعرۂ احتجاج بلند کرتے رہے:۔

پروفیسر احتشام حسین پریم چند کی انڈین نیشنل کانگریس نیز دیگر تحریکوں سے وابستگی کا

---

[۱] گئودان ۱۹۵۵ء ص ۱۷۔ [۲] تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص ۵۵۹-۶۰۔

[۳] یوسف سرمست "بیسویں صدی میں اردو ناول" ص ۷۲۔

ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"انڈین نیشنل کانگریس سے تو انہیں فکر کے ذریعے اصلی غذا ملتی تھی لیکن وہ دوسری سماجی و اصلاحی تحریکوں سے بھی غذا لیتے تھے۔ چنانچہ رانا ڈے وغیرہ کی سماجی اور اصلاحی تحریکوں کا عکس ان کے افسانوں اور ناولوں میں واضح طور پر ملتا ہے"[۱]

موضوع کے اعتبار سے پریم چند کے ناول دو اقسام میں منقسم ہیں۔ پہلے قسم کے ناولوں میں ہندوؤں کے معاشرتی حالات اور مقاصد کی اصلاح کا عنصر ملتا ہے اور ان میں حب الوطنی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ان کے اس قسم کے ناولوں میں "جلوۂ ایثار" "بیوہ"۔ "بازارِ حسن"۔ "پردۂ مجاز" "غبن" اور "نرملا" شامل ہیں۔ پریم چند کے دوسرے قسم کے ناول موضوعات اور مقصد کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ ان میں معاشرتی مسائل کے ساتھ ساتھ ملک کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔

احتشام حسین "تنقید اور عملی تنقید" میں پریم چند کے نظریات کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"پریم چند اپنے دور کے شعور کے ان پہلوؤں کے ترجمان ہیں جو غلامی پر آزادی کو، قدامت پرستی پر اصلاح کو، تنگ نظری پر بلند نگاہی کو، طبقاتی جبر و ظلم پر انصاف اور مساوات کو، سامراج اور آمریت پر جمہوریت کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ ملک کی عوامی زندگی کو اُبھارنے اور بہتر بنانے کے لئے جدوجہد کے ترجمان تھے"[۲]

پریم چند نے حصولِ آزادی کو اپنی تحریروں کا مقصد بنایا۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصنیفیں چھوڑ جاؤں لیکن اس کا مقصد بھی حصولِ آزادی ہو گا"[۳]

---

[۱] احتشام حسین "ذوق ادب و شعور" ص ۲۱۹۔ [۲] احتشام حسین "تنقید اور عملی تنقید" ص ۷۹-۱۷۸۔
[۳] "زمانہ" کانپور، پریم چند نمبر، ص ۴۲۔

پریم چند نے اپنی تحریروں، ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ ملک و قوم کی خدمت انجام دی۔ قومی شعور اور قومی تحریکوں میں ایک نئی روح پھونکی۔

ترقی پسند تحریک سنہ ۱۹۳۶ء

ترقی پسند تحریک کی جہاں ابتدا ہوتی ہے وہاں پریم چند کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام سنہ ۱۹۳۵ء میں لندن میں عمل میں آیا۔ لیکن اس نے باضابطہ تحریک کی شکل سنہ ۱۹۳۶ء میں اختیار کی۔ اس انجمن کے قیام کے سلسلے میں سجاد ظہیر کا نام خاص طور پر سامنے آتا ہے۔ علاوہ ازیں محمد دین تاثیر، محمد علی، ملک راج آنند اور جیوتی گھوش وغیرہ کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جب آزادی کی جد و جہد اپنے شباب پر تھی۔

گوپال متل نے اپنی کتاب "ادب میں ترقی پسندی" آزادی کے ذیل میں لکھا ہے:-

"قومی آزادی کی جد و جہد اپنے آخری مرحلوں میں داخل ہو رہی تھی اور اس کی گھن گرج ہر کان تک پہنچ رہی تھی۔ اس کی آوازِ بازگشت افسانوی ادب میں بھی سنائی دیتی تھی"[1]

انجمن ترقی پسند مصنفین کا اصل محرک سجاد ظہیر ایک نوجوان تھا۔ اس انجمن کی پہلی کانفرنس ۱۰ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں منعقد ہوئی اور منشی پریم چند نے اس کانفرنس کی صدارت کے فرائض انجام دیئے۔

ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد پریم چند کا دور ختم ہو گیا اور ادب کی باگ ڈور براہ راست ترقی پسند مصنفین کے ہاتھوں میں آگئی۔ سنہ ۱۹۳۶ء کے ادب نے ایک نیا موڑ لیا۔ خیالات اور رجحانات اور نظریات میں تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ اور جدید طرز کا ادب تخلیق کیا جانے لگا۔ اس دور کے ناول نگاروں میں سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، مرزا سعید، اپندر ناتھ اشک، عزیز احمد، رشید اختر ندوی، رشید جہاں، فضل حق قریشی، اشرف صبوحی، انصار ناصری، ظفر قریشی، نجم الدین شکیب وغیرہ کا نام سامنے آتے ہیں۔ ان کے ناول واقعات سے قطع نظر ایک خاص عہد کے سیاسی

---

[1] گوپال متل "ادب میں ترقی پسندی" ص ۱۷۔

اور معاشی انتشار اور اضطراب کے پیدا کئے ہوئے کرداروں پر مبنی ہیں۔ یہ کردار اپنے دور کے سیاسی انتشار کا عکس ہیں۔ ان کرداروں کے ذہن بے شمار اور مستقل الجھنوں کی آماجگاہ ہیں۔ یہ الجھن ان کے ماحول کی دی ہوئی ہیں۔ اور سیاسی نظریات، معاشی تصورات اور جنسی محرکات کی باہمی کشمکش اور تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔ اس دور کے ناول نگاروں نے ہندوستان کے سیاسی پس منظر میں ادب کو تخلیق کیا۔ اس دور میں تخلیق کیے گئے ناولوں میں کرشن چندر کا ناول "شکست"، سجاد ظہیر کا ناول "لندن کی ایک رات"، عصمت چغتائی کا "ٹیڑھی لکیر" اور عزیز احمد کا "گریز" سامنے آتے ہیں۔

کرشن چندر کا ناول "شکست" ۱۹۳۶ء کے بعد کے سیاسی بحران کا آئینہ دار ہے۔ اس ناول کے کرداروں میں حب الوطنی اور وطن پرستی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اور وہ اپنی ملک کی خاطر جان کی بازی لگا دینے کو تیار ہوں۔ لیکن ان سب حقائق کا اظہار براہِ راست ناولوں میں نہیں ملتا۔

کرشن چندر کے ناول "شکست" میں شیام ایک مرکزی کردار ہے۔ علی جو نائب تحصیلدار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ شیام اور علی جو کے مابین گفتگو کا سلسلہ جاری ہے۔ شیام کہتا ہے کہ آج کل سیاسی اعتبار سے حالات نسبتاً بدلتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

عوام میں سیاسی بیداری پھیل رہی ہے۔

سیاسی بیداری اجی صاحب

جہاں پہلے جاگیر دار لوٹتے ہیں، عوام تو ایک غیر منظم، منتشر قوت ہے۔ اسے سنبھالنا اسے استعمال کرنا، چند سمجھدار لوگوں کا کام رہا ہے۔ شروع سے چند لوگ بہت سے لوگوں پر حکومت کرتے چلے آئے ہیں۔ ہمیشہ سے، چاہے یہ حکومت جاگیردارانہ ہو یا جمہوریت یا آمریت۔

شیام صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ یہ سب اصطلاحیں عوام کو گمراہ کرنے کے لیے، انہیں اپنے قابو میں لانے کے لئے گھڑی گئی ہیں۔[1]

---

[1] کرشن چندر "شکست" ص ۳۲۔

اس سلسلے میں "شکست" کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

"علی جو کی باتوں سے ایک وحشی بے رحمی کی بُو آتی تھی۔ باتیں بڑی کڑوی تھیں لیکن اس میں صداقت ضرور تھی۔ حکومت چاہے کیسی ہی کیوں نہ ہو جبر و استبداد کے بغیر ایک لمحہ نہیں جی سکتی۔ چاہے یہ حکومت جمہوری ہو یا اشتراکی ہو۔ جبر و استبداد اس کی بنیاد ہے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ حکومت ہو۔ کیا انسان کی زندگی حکومت کے بغیر نہیں ہو سکتی کیا ابھی تک انسان کو خوف کا احساس کرائے بغیر اس سے کوئی اچھا کام نہیں کروا جا سکتا اس نے سوچا اگر حکومت نہ ہو تو پھر کیا ہو، شاید انسانی سماج ایک جنگل بن جائے گا۔"[1]

کرشن چندر کے خیالات اور نظریۂ فکر سوشلسٹ تھے وہ جمہوریت اور مساوات میں یقین رکھتے تھے۔ کرشن چندر کی تمام تخلیقات ہندوستان کے سیاسی بحرانی دور میں تصنیف کی گئیں۔ اس دور کے ناولوں میں خلوص و یگانگت، حب الوطنی اور انسان دوستی کا جذبہ کارفرما ہے۔

پریم چند کے بعد اردو میں جو اہم ناول نگار نظر آتے ہیں ان کا تعلق براہ راست ترقی پسند تحریک سے رہا۔ انہوں نے اس دور کے سیاسی حالات اور طبقاتی کشمکش کو دیکھا، پرکھا اور انہیں تجربات کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ اس دور کے ناول نگاروں میں سجاد ظہیر کا نام بھی سامنے آتا ہے۔ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے محرک اور روح رواں تھے۔ ان کا ناول "لندن کی ایک رات" ۱۹۳۷ء میں منظر عام پر آیا۔ جو ادبی سے زیادہ تاریخی اور سیاسی ہے۔

وقار عظیم "لندن کی ایک رات" کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

"اس ناول کا انداز سر تا سر فکری ہے اور اس فکری انداز نے ہندوستان اور اس کے باہر کے ذہن کی الجھنوں کی مصوری کی ہے۔"[2]

خلیل الرحمٰن اعظمی "لندن کی ایک رات" کے کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

---

[1] کرشن چندر "شکست" ص ۳۴۔ [2] وقار عظیم "داستان سے افسانے تک" ص ۵۹۔۱۵۸۔

"سجاد ظہیر نے مختلف کرداروں کے ذریعے ہندوستان کے متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کے نوجوانوں کی عکاسی کی ہے اور اس طور پر اپنے دور کے سیاسی اور تہذیبی مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔"[1]

"لندن کی ایک رات" کے ہندوستانی کردار اپنے ملک و قوم سے محبت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اعظم اس ناول کا اہم کردار ہے۔ وہ لندن میں ایک مقام پر کھڑا جمیس کا منتظر ہے اچانک اس کی نگاہ سامنے لگے ہوئے چند اشتہاروں پر پڑی۔ اخبار میں جلی حروف میں لکھا تھا:

"بیکار مزدوروں کا ہارڈ پارک میں جلسہ"

"دس انگریز سپاہیوں نے دس ہزار نیٹوز کو فساد کرنے سے روکا۔"

"ایک گورا زخمی ہوا اور ۱۵ نیٹوز کی جان گئی" بڑے بڑے کوئی ڈھائی فٹ لمبے اور ایک فٹ چوڑے کاغذوں پر یہ اشتہار سرخ حرفوں میں لکھے ہوئے تھے۔ اعظم کا خیال ایک لمحے کے لئے اپنے دوست کے انتظار سے ہٹ کر ہندوستان وطن کی طرف گیا۔

"یہ کمبخت انگریزی اخبار کتنی حقارت کے ساتھ ہم ہندوستانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ "نیٹوز" ہم نیٹوز ہیں اور یہ لال منھ بندر جو اس ملک میں رہتے ہیں، یہ کون ہیں؟"[2]

اعظم اور راؤ دونوں گفتگو کرتے جا رہے ہیں لیکن اعظم حسین کی وجہ سے بے چین تھا کیونکہ حسین وعدے کے مطابق نہیں پہنچ سکی تھی۔ اعظم اچانک بولا:۔

"راؤ تم نے آج کا اخبار دیکھا؟ ہندوستان میں پھر کہیں گولی چلی۔"

اعظم نے کہا: "نہیں میں نے اخبار تو نہیں دیکھا۔ مگر اشتہار دیکھے ہیں۔ اب تو یہ

---

[1] خلیل الرحمٰن اعظمی "اردو میں ترقی پسند تحریک" ص ۱۲۰ [2] سجاد ظہیر "لندن کی ایک رات" ص ۷

روز کا دستور ہوتا جا رہا ہے۔ ہم کالے آدمیوں کی جان کیڑے مکوڑوں کے برابر ہے۔ اور قصور ضرور ہمارا ہی ہوگا.....

خیال تو کرو ۳۵ کروڑ انسان اور ایک لاکھ سے بھی کم انگریز ان پر مزے سے حکومت کرتے ہیں اور حکومت بھی کیسی حکومت:"[1]

راؤ اور اعظم کی گفتگو جاری تھی کہ :

"اچانک راؤ کی آنکھوں کے سامنے ہندوستانیوں کی ایک بھیڑ نظر آئی۔ دس انگریز سپاہیوں نے دس ہزار نیٹوز کو فساد کرنے سے روکا۔ ایک گورا زخمی ہوا اور ۱۵ انیٹوز کی جان گئی"[2]

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "لندن کی ایک رات" کے کردار اپنے ملک کو آزاد کرانے میں کس درجہ کوشاں ہیں۔ وہ انگریزوں سے نفرت کرتے ہیں اور ہندوستانیوں کے تئیں بڑی محبت کا جذبہ رکھتے ہیں۔

"لندن کی ایک رات" کے کردار بے چینی اور کرب میں مبتلا نظر آتے ہیں اور غلامی سے نجات کے طلب گار ہیں۔ وہ سماجی جکڑ بندیوں اور حکمراں طبقے کی غلامی سے نجات پانا چاہتے ہیں اور آزاد زندگی گذارنے کے متمنی ہیں۔

ترقی پسند ناول نگاری میں عصمت چغتائی کا نام بھی نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ ان کے ناولوں کے پلاٹ سماجی اور سیاسی ہیں۔ ان کے ناولوں میں سماجی برائیوں کے ساتھ ساتھ معاشی بدحالی اور بے راہ روی ملتی ہے۔ ٹیڑھی لکیر (سنہ ۱۹۳۶ء) عصمت کا بہترین ناول ہے۔ عصمت نے "ٹیڑھی لکیر" میں زندگی اور سماج کو موضوع بنا کر سیاست سے بحث کی ہے۔ اس ناول کے نصف آخر میں ہندوستانی سیاست سے خاص بحث کی گئی ہے۔ اس کے کردار اپنے وطن سے محبت اور سفید فام لوگوں سے نفرت کا جذبہ رکھتے ہیں۔

۱۹۳۶ء کے بعد کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے بڑا ہیجان انگیز زمانہ تھا۔ عصمت بھی ان سیاسی تحریکات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ انہوں نے اس کا اظہار

---

[1] سجاد ظہیر "لندن کی ایک رات" ص ۱۲

[2] ۲۱

اپنے ناولوں کے ذریعے کیا۔

ٹیڑھی لکیر کے دو اہم کردار شمن اور ٹیلر آپس میں ہندوستان کی سیاست پر گفتگو کر رہے ہیں۔ ٹیلر کے الفاظ میں ٹیڑھی لکیر کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

"ملک کی سب سے بڑی جماعت نے علم بغاوت بلند کیا۔ یہ بغاوتیں ریل کے ڈبوں میں پورے زور خروش سے رونما ہوئیں۔ سفید فام قوم کو کھلا حکم مل گیا کہ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ نہیں مانگتے تم کو، ورنہ بسیں جلا ڈالیں گے۔ ریل کی پٹریاں اکھیڑ دیں گے"[1]

شمن اور بٹلر کے درمیان محبت ہونے کے باوجود شمن کے دل میں سفید فام لوگوں کے لئے سخت نفرت ہے۔ اس کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ برابر کام کر رہا ہے۔ ایک سفر کے دوران شمن اور بٹلر میں سیاسی مسائل پر بحث ہو رہی ہے۔ شمن اگست میں پیش آنے والے ایک واقعہ کا ذکر کرتی ہے جو انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کا ایک جرأت مندانہ اقدام تھا۔ اس ناول میں صفحہ ۴۱۲ سے لیکر ۴۱۷ تک اس دور کی تحریک آزادی کی تحریکوں سے بحث کی گئی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"آزادی کی دیوی بھینٹ چاہتی ہے اور اگر اسے رام کرنا ہے تو ایسی ایسی لاکھوں قربانیاں کرنی ہوں گی جو کچھ ان سر پھرے جوشیلے بچوں نے کیا وہ واقعی بہت معمولی نظر آتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ ہوا بے ترتیبی اور بد انتظامی سے ہوا اگر یہ قربانی باقاعدہ دی جاتی تو آزادی کے میدان کا تھوڑا بہت حصہ ضرور ہاتھ آجاتا۔"[2]

جس طرح پریم چند کا ناول گئودان ادب کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے اس طرح "ٹیڑھی لکیر" کو بھی عصمت کا شاہکار کہہ سکتے ہیں۔

وقار عظیم عصمت کے تصورات اور فکر کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی کتاب "داستان سے افسانے تک" میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] عصمت چغتائی "ٹیڑھی لکیر" ص ۴۲۳۔
[2] ص ۴۲۴۔

"عصمت چغتائی نے اپنے ذاتی مشاہدے کو گہری فکر اور وسیع تخیل میں سمو کر ٹیڑھی لکیر میں انجام دیا ہے۔ اب تک کوئی عورت ناول نگار انجام نہ دے سکی [۱]"

اس سلسلے کی ایک کڑی عزیز احمد تھے۔ عزیز احمد ترقی پسند تحریک کے حامی تھے۔ وہ ممتاز افسانہ نگار اور نقاد ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ ناول نگار بھی تھے۔ انہیں نے "گریز" ۱۹۴۲ء میں تصنیف کیا۔ عزیز احمد نے ناول کے میدان میں ہیئت اور تکنیک کے کچھ خاص تجربے کئے، اور اچھوتے موضوعات کو اپنے یہاں جگہ دی۔

وقار عظیم " داستان سے افسانے تک" میں گریز کی قدر وقیمت اور اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"گریز' عالمگیر جنگوں کے درمیان کے پُر آشوب یورپ اور انگلستان کی زندگی کا ناول ہے۔ اس میں اس عہد کے حقائق کا غلبہ ہے جنہیں مصنف نے مزے لے لیکر بیان کیا ہے۔ اور اپنے قاری کو اس مزے میں پوری طرح شریک ہونے کی دعوت دی ہے [۲]"

'گریز' ایسے ہیجان انگیز دور میں تخلیق کیا گیا جب سلطنت برطانیہ دم توڑ رہی تھی۔ ہندوستان سے انگریزوں کے پیر اکھڑنے لگے تھے۔ انگریز حکام تذبذب اور کشمکش کے عالم میں مبتلا تھے۔ دوسری جنگ عظیم عروج پر تھی۔ ہندوستان بڑے نازک دور سے گذر رہا تھا۔ بایں ہمہ ہندوستان میں آزادی کا سورج طلوع ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔ ڈاکٹر معین عقیل اس دور کے سیاسی تناظر میں "گریز" کے بارے میں رقم طراز ہیں:۔

"گریز' پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی عہد کے سیاسی اور معاشی ماحول کا ایک منتشر ترجمان ہے۔ یہ یورپ اور انگلستان کے سیاسی اور معاشرتی زندگی کے ایک پرشور زمانہ کا عکاس ہے جسے پڑھ کر وہ سیاسی اور معاشی محرکات سامنے آتے ہیں جو یورپ کے زیرِ اثر اس وقت کے عالمی

---

[۱] وقار عظیم " داستان سے افسانے تک" ص ۱۳۵۔
[۲] " " " "

مسائل تھے۔ اس ناول کے سیاسی اور معاشی پس منظر میں جنسی نفسیات کا
بھی سہارا لیا گیا ہے۔ جو دوسرے عوامل کے ساتھ ساتھ فرد کی
زندگی کے انقلابات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے مرکزی کردار
کو انگلستان کے دورانِ قیام میں پہلی بار نسلی امتیاز اور اپنی
سیاسی محکومی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنی "انتظامی حرکتوں"
سے فراریت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مجموعی طور پر اس میں پورے یورپ
اور اس کا سیاسی و اقتصادی و جنسی اقدار کو ایک ہندوستانی کے
نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار حکومت کا کارندہ
تو ہے لیکن باطنی طور پر مضطرب اور غیر مطمئن۔"

بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ اردو ناول نگاری میں نذیر احمد سے لے کر پریم چند تک اور
اس سے ذرا آگے بڑھ کر ترقی پسند ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کے ذریعے براہِ راست اور
بالواسطہ دونوں طرح سے عوام میں آزادی کی تحریکوں کے تئیں گرمی پیدا کی، قومی شعور کو بیدار
کیا۔ جس سے ہندوستانیوں کے عزم اور حوصلوں میں پختگی پیدا ہو گئی۔

تحریکِ آزادی

اُردو افسانہ

اُردو نثر کی دیگر اصناف کی طرح اُردو افسانوں نے بھی آزادی کی تحریک میں خاطر خواہ حصّہ لیا۔ اور ہندوستان کے عوام کے قومی شعور کو بیدار کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوئے جس سے حرّیت پسندوں کے عزائم میں اس تحریک کے تئیں پختگی پیدا ہو گئی۔

اُردو میں مختصر افسانے کی روایت زیادہ پُرانی نہیں ہے۔ افسانہ مغرب کے اثرات سے آیا اور بہت کم عرصہ میں نثر کی تقریباً تمام تخلیقی اصناف پر غالب آگیا۔ اور ادبی حلقوں میں مقبول ترین صنف ادب تسلیم کیا جانے لگا۔ اُردو افسانہ کی تاریخ میں پریم چند کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

پریم چند افسانے کا رہنما ہے کیونکہ پریم چند نے افسانے کو فن دیا اور فن کی تعمیر بھی کی۔ لیکن پریم چند کو افسانے کا موجد کہنا مناسب نہیں۔ پریم چند سے قبل بھی مختصر افسانے کے نمونے مختلف رسائل میں مل جاتے ہیں۔ ان رسائل میں خصوصاً دل گداز، اودھ پنچ، خاتون، خدنگ نظر، مخزن الفاظ وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں۔ پریم چند سے قبل جن ادیبوں اور تخلیق کاروں نے مغربی افسانے کے فن اور اس کے تصور سے ادبی دنیا کو روشناس کرایا ان میں خاص طور سے سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، راشد الخیری، علی محمود یانکی پوری کے نام نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

وقار عظیم "نیا افسانہ" میں اُردو افسانے کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:۔

"ناول کی طرح افسانہ بھی اُردو میں انگریزی کے اثر سے آیا۔ ناول اس

کے مقابلے میں ایک گمنام چیز بن کر رہ گیا۔ مختصر افسانے کی ابتداء
ایک ایسے زمانے میں ہوئی جب ہندوستانی سماج میں سیاسی،
معاشرتی اور قومی رہنما اس انتشار سے گھبرا کر ملک کی نئی تحریک
پھیلا کر عوام میں اپنے مٹتے ہوئے تمدن کی محبت اور ان کی جگہ
لینے والے ایک نئے نظام کی طرف سے محنت کا جذبہ پیدا کرنے
کی کوشش میں مصروف تھے۔[۱]

پریم چند کے بغیر اردو افسانے کی تاریخ ادھوری اور نامکمل نظر آتی ہے۔ پریم چند کا تخلیقی سفر ۱۹۰۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۶ء میں ختم ہو جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی معاشرہ پرانی قدروں کو چھوڑ کر نئے سماج میں قدم رکھ رہا تھا۔ مختلف قسم کی تحریکیں ابھر رہی تھیں۔ یہی وہ دور تھا جب پریم چند نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ پریم چند کی پہلی کہانی "دنیا کا سب سے انمول رتن" ۱۹۰۷ء میں "زمانہ" کانپور میں شائع ہوئی۔

افسانہ "قاتل" میں دھرم ویر ایک اہم کردار ہے جو ایک قوم پرست سبھا کا کارکن بھی ہے۔ اس کی بوڑھی ماں محبِ وطن ہے اور اعتدال پسند ہے۔ وہ دھرم ویر کے انتہا پسند رویّے کو پسند نہیں کرتی اور اس سبھا پر مختلف طرح سے اعتراضات کرتی ہے۔ دھرم ویر اپنی بوڑھی ماں سے کہتا ہے:۔

"جو تم کرتی ہو، وہی ہم کرتے ہیں، تمہارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے۔ ہمارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے۔"

بوڑھی ہوں، جنگ آزادی میں دل و جان سے شریک تھی دس سال قبل اس کا شوہر ایک باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں سزایاب ہوا تھا۔ جیل میں اس کی صحت خراب ہو گئی تھی اور جیل ہی میں راہی عدم ہوا۔ تب سے یہ بیوہ عفت آمیز خلوص و انہماک سے خدمتِ

---

[۱] وقار عظیم "نیا افسانہ" ۱۹۷۷ء ص ۱۷۔

قوم میں مصروف تھی۔[1]

بوڑھی ماں اور دھرم ویر میں گفتگو جاری ہے۔

دھرم ویر: وہ (انگریز) ہندوستان اسی وقت چھوڑیں گے جب انھیں یقین ہو جائے گا کہ وہ ایک لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار انگریز قتل کر دیئے جائیں تو آج ہی سوراج مل جائے گا۔ روس اسی طرح آزاد ہوا۔ آئرلینڈ اسی طرح آزاد ہوا اور ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہوگا۔ کوئی اور طریقہ نہیں ہے ان کا خاتمہ کر دینا ہے۔ ایک گورے افسر کے قتل کر دینے سے حکومت پر جتنا خوف طاری ہوتا ہے اتنا ایک ہزار جلوسوں سے ممکن نہیں۔[2]"

غرض کہ ابتدائے سے آخر تک افسانے میں دھرم ویر انتہا پسند اور جذباتی نظر آتا ہے اور پورا افسانہ حب الوطنی کے جذبے سے معمور ہے۔

عزیز فاطمہ "افسانے کا سماجی و ثقافتی پس منظر" میں لکھتی ہیں:۔

"ملکی و بین الاقوامی سیاسی تحریکیں اکثر افسانوں کا محرک رہیں۔ سیاسی تحریکیں چونکہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے افسانہ نگاروں کے مواد کو فراہم کرتی رہتی ہیں۔ سیاسی افسانوں کی ابتدار پریم چند سے ہی ہوتی ہے جن کی وجہ سے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" حکومت نے ضبط کر لیا۔[3]"

بیسویں صدی کا آغاز ہندوستان میں مختلف تحریکوں کو لیکر آیا۔ نئے رجحانات سامنے آئے، اور سیاست نے نیا موڑ لیا۔ ہندوستان کے علاوہ بھی دنیا کے مختلف خطے انتشار اور بے چینی کے عالم میں مبتلا تھے۔ سیاسی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ چین، ترکی، اور ایران میں بھی یہی صورت نظر آتی تھی۔ اسی دوران یعنی سنہ ۱۹۰۶ء میں ہندوستان میں مسلم لیگ کا

---

[1] پریم چند "قاتل" ص ۲۶۔
[2] " " ص ۲۶۔
[3] عزیز فاطمہ "اردو افسانے کا سماجی و ثقافتی پس منظر" ص ۴۱۔

قیام بھی عمل میں آیا۔ جس کا ردعمل یہ ہوا کہ مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آ گئے۔ ادھر نوجوان طبقہ بھی متحرک ہو گیا۔ اسی سال ہند و مہاسبھا کی داغ بیل پڑی۔ یہی وہ دور تھا جب پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ "سوزِ وطن" ۱۹۰۸ء میں شامل پریم چند کی کہانیوں میں حب الوطنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اور ان سے بغاوت کی بُو آتی تھی۔ جو انگریزوں کی جابرانہ عملداری کیخلاف تھی۔ لہٰذا حکومت نے اس مجموعہ کو ضبط کر لیا۔ "سوزِ وطن" کی کہانیوں کے بارے میں پریم چند لکھتے ہیں :-

"کتاب نکلے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ ایک دن رات کو میں کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر صاحب کا (جو انگریز تھے) پروانہ پہنچا کہ فوراً مجھ سے ملو۔ جاڑے کا موسم تھا۔ میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ انکے سامنے "سوزِ وطن" کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی۔ صاحب نے مجھ سے پوچھا۔
کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے ؟ میں نے کہاں ہاں"۔
صاحب نے ایک کہانی کا مطلب مجھ سے دریافت کیا اور آخر میں بگڑ کر بولے
تمہاری کہانیوں میں سیڈیشن بھرا ہوا ہے۔ اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریز عملداری ہے۔ مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے ہاتھ کاٹ ڈالے جاتے۔ تمہاری کہانیاں یک طرفہ ہیں۔ تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے [۱]"

پریم چند پر باغی ہونے کا الزام لگا دیا گیا اور یہ پابندی لگا دی گئی کہ وہ حکومت اور خصوصاً کلکٹر صاحب کی اجازت کے بغیر کوئی بھی کہانی شائع نہیں کرا سکتے۔ "سوزِ وطن" پانچ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان کہانیوں میں "دنیا کا سب سے انمول رتن"، "شیخ مخمور"،

---

[۱] قمر رئیس "پریم چند شخصیت اور کارنامے" ۱۹۸۳ء ص ۳۲۸۔

"یہی میرا وطن ہے"، "صلہ ماتم"، "عشق دنیا" اور "حب وطن" شامل ہیں۔ پریم چند "سوز وطن" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"ہر ایک قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے، جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینہ میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشہ میں متوالے ہو رہے تھے۔ اس زمانہ کی یادگار بجز عاشقانہ غزلیں اور کچھ چند خیالی کہانیوں کے اور کچھ نہیں۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیئے جب قوم کے نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاحِ تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص و حکایات زیادہ تر اصلاحی اور تجدید کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینہ پر ایک اور قدم بڑھایا اور حب الوطنی کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگے۔ کیونکہ ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقیناً جوں جوں ہمارے خیال وسیع ہوتے جائیں گے اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حبِّ وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں[1]"

"سوز وطن" کے افسانوں سے بغاوت کی بُو آتی ہے اور "حب الوطنی کے جذبات ابھرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" اس جملے پر ختم ہوتا ہے۔ "وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے

---

[1] قمر رئیس "پریم چند شخصیت اور کارنامے"، ص ۳۱ - ۳۲۔

بیش قیمت شے ہے۔"

"یہی میرا وطن ہے" سوزِ وطن کا تیسرا اور سب سے چھوٹا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے شخص کی حب الوطنی کا مرقع ہے جو ساٹھ برس امریکہ میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کرکے اپنے وطن کے دیدار کی تمنا لے کر اپنے پیارے وطن کو واپس آیا ہے۔

"عشق دنیا" اور "حب وطن" کا موضوع بھی حب الوطنی ہے۔ اس افسانے میں اٹلی کی محب وطن "میری" کی حسرت ناک زندگی کے چند عبرتناک مناظر کو بیان کیا گیا ہے، جو ہندوستانیوں کے دلوں کو بھی بہت متاثر کرتے ہیں۔

سوز وطن کی کہانیوں میں "صلہ ماتم" کو چھوڑ کر باقی چار کہانیوں میں ہمیں ایک ایسے سچے دردمند اور پُر خلوص عاشق وطن کی روح مچلتی اور تڑپتی نظر آتی ہے، جو وطن کی ہر چیز اور خصوصًا وطن کی آزادی کو والہانہ جذباتیت کے ساتھ ایک روحانی انداز سے دیکھتا ہے۔ وطن کی آزادی اور وطن کی محبت کے احساس پر اقتصادی اور معاشی اہمیت نے آگے چل کر جو غلبہ حاصل کر لیا۔ اس کی جذباتیت اور روحانیت اس سے قطعی ناآشنا ہے۔ اس کے نزدیک وطن سے محبت کرنا اور اس پر اپنا تن من دھن نچھاور کر دینا انسانی فریضہ ہے۔

وقار عظیم "داستان سے افسانے تک" میں پریم چند کے افسانوں کی سیاسی اور قومی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے عبد الماجد دریا آبادی کی رائے کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

> "ہندوستان میں تحریک وطنیت کی تاریخ مورخ کا قلم آج سے سو پچاس برس بعد لکھے گا تو اس میں تیس بتیس برس کی تاریخ سمجھنے کے لئے جہاں گاندھی جی، موتی لال، جواہر لال، داس، محمد علی، انصاری، اور ابو الکلام آزاد کی تقریریں اور تحریریں پڑھنی لازمی ہوں گی، وہاں پریم چند کے افسانے بھی ناگزیر ہوں گے"[1]

---

[1] وقار عظیم "داستان سے افسانے تک" ص ۲۶۳۔

پریم چند محب وطن تھے انہیں وطن سے بے پایا محبت اور لگاؤ تھا۔ ہندوستان کے غریب عوام ہوں یا دیہاتوں کے کسان، وطن کی زمین ہو یا وطن کا ماحول وہ اپنے وطن سے خاص انسیت اور محبت رکھتے تھے۔ ان کے افسانوں میں بھی یہی خیال پایا جاتا ہے۔ ہنسراج رہبر پریم چند کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"انہوں نے افسانوں کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ وہ وطن اور انسان کی خدمت کا ایک وسیلہ بن سکتا ہے۔ ان کی زندگی کے آخری دور تک ہندوستان سیاسیات میں تیزی سے تغیر پیدا ہوتا جارہا تھا۔ پریم چند نے بڑی لگن کے ساتھ اس تغیر کا ساتھ دیا۔ کانگریس سے تو انہیں اپنی فکر کے لئے غذا ملتی رہتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی وہ دوسری سماجی اور اصلاحی تحریکوں سے بھی اثر لیتے رہتے تھے۔ چنانچہ راناڈے، گوکھلے، تلک، لاجپت رائے وغیرہ کی سماجی اور سیاسی اصلاح کی تحریکوں کا عکس ان کے افسانوں اور ناولوں میں واضح طور پر ملتا ہے[۱]۔"

پریم چند کے ان افسانوں میں جو خصوصاً جنگِ آزادی کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ ڈامل کا قیدی، قاتل، آخری تحفہ، جیل، جلوس، آشیاں برباد، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان افسانوں میں آزادی کی تحاریک اور تحریکِ ترکِ موالات کے واقعات بھی نظر آجاتے ہیں۔ افسانہ "لال فیتہ" میں سیاسی تحریکوں سے متاثر ہونے اور سرکاری ملازمتوں سے عوام کے مستعفی ہونے کے واقعات ملتے ہیں۔ پریم چند کے اسی طرح کے افسانوں میں "راج ہٹ"، "منزل مقصود" اور "آہ بیکس" شامل ہیں۔

افسانہ "آخری تحفہ" اس کے کردار سودیشی اور پکٹنگ کی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں۔ اس میں امرناتھ اور مالتی دو اہم کردار ہیں۔ امرناتھ محب وطن ہے وہ ان تحریکوں میں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ اسی طرح افسانہ "جیل" میں وشومبھر کا کردار زیادہ نمایاں نظر آتا ہے وہ بی۔ اے کا طالب علم ہے اور اپنی تعلیم کی پرواہ کئے بغیر سودیشی تحریک میں حصہ لیتا ہے۔ روپ متی

---

[۱] ہنسراج رہبر "پریم چند" ص ۲۰۹۔

اس کی جرات اور حوصلے کو خوش آمدید کہتی ہے اور اس کی تعریف کرتی ہے۔

افسانہ "آشیاں برباد" میں عورتوں کی جدوجہد آزادی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار "مرولا" کی شکل میں پریم چند نے اس عورت کو پیش کیا ہے جو ظلم رسیدہ ہونے کے باوجود عالی ہمت اور بلند حوصلہ ہے۔ اور آزادی کی جنگ میں شریک ہے۔ اس کا بیٹا، شوہر اور ماں جنگ آزادی کی لڑائی میں مارے جا چکے ہیں۔ اس کے یہ الفاظ اس کی بلند حوصلگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

"..... ایک بار جی میں آیا بھی انہیں کے ساتھ چتا میں جا بیٹھوں، سارا کنبہ ایک ساتھ، ایشور کے دیار میں جا پہنچے۔ لیکن پھر میں نے سوچا تو نے ابھی ایسا کام ہی کونسا کیا ہے، جس کا معاوضہ یہ ملے۔"[لے]

اس افسانے کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"ہم نے ایک درخت کے سائے میں اپنا دفتر قائم کیا اور کام کرتے رہے، شام کو ہم نے ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ ..... لوگ کہتے ہیں جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں، مستعد ہیں۔ میدان سے ہٹتے نہیں۔ ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خودداری کا ثبوت دینا تھا۔ دکھانا تھا کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبۂ آزادی سے دست بردار ہونے والے نہیں ..... وہ (حکومت) یہ دکھانا چاہتی تھی کہ ہم تمہارے اوپر حکومت کرنے آئے ہیں، اور حکومت کریں گے۔ تمہاری خوشی یا ناخوشی کی قوم کو پرواہ بھی نہیں، جلوس نکالنے کی ممانعت کر دی گئی ..... آج کانگریس کی صدارت کا فخر مجھے عطا کیا گیا تھا۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طاقت کا احساس کر رہی تھی۔ ایک کمزور عورت جسے بولنے کا بھی شعور نہیں، جس نے کبھی گھر سے قدم نہیں نکالا۔ آج اپنے پیاروں کی قربانیوں کی بدولت

لے پریم چند "آشیاں برباد"

اس مرتبے پر پہنچ گئی تھی جو بڑے بڑے سرکاری افسر کو بھی، بڑے سے بڑے مہاراجہ کو بھی حاصل نہیں[1]"

دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کے سفاکانہ مظالم نے اور بھی شدت اختیار کرلی۔ جلیانوالہ باغ کا سانحہ، حکومت کا ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک، ہندوستانیوں کی اہانت اور استحصال، یہ سب وہ امور تھے جنہوں نے ہندوستانیوں کو زندہ اور بیدار کرنے اور ان کے ارادوں کو مصمم بنانے کی فضا پیدا کردی۔ سارا ملک آزادی کی لہر میں آگیا۔ مسلمانوں میں اتحاد اور یک جہتی پیدا ہوگئی۔ وطن کی محبت نے کروڑوں عوام کے دلوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں جب سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی اُردو کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اخباروں نے مضامین کے ذریعے اور ادیبوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ آزادی کے جذبہ کو بیدار کیا۔

اس سلسلے میں سردار جعفری رقمطراز ہیں :-

"اردو والوں نے آزادی کی جدوجہد کو قومی دائرے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے دائرے بین الاقوامیت سے ملائے اور اس طرح ایک زیادہ جاندار اور ہمہ گیر شعور کو عام کیا[2]"

پریم چند نے اپنی تحریروں اور خصوصاً افسانوں کے ذریعہ ملک وقوم کی خدمت انجام دی۔ انہوں نے ایسے دور میں قدم اٹھایا جب ہندوستان سیاست کی آگ میں جل رہا تھا۔ انگریز حکمراں ہندوستان اور ہندوستان کے عوام کو نیست ونابود کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ پورا ملک افراتفری کے عالم میں مبتلا تھا۔ حریت پسند اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے جدوجہد کررہے تھے اور ان کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ پریم چند نے ان تمام موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ انہوں نے گاندھی جی اور دیگر سیاسی رہنماؤں کے سیاسی نظریات کو اپنے افسانوں کے ذریعے عوام تک پہنچایا۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں پریم چند کی وفات ہوگئی لیکن انہوں نے اپنی زندگی میں اردو افسانہ نگاری

---

[1] پریم چند "آشیاں برباد"۔ [2] صبا۔ حیدرآباد اردو کانفرنس نمبر، ص ۸۹۔

میں جو چراغ جلائے تھے ان کی روشنی اردو ادب کی فضاؤں کو آج منور کئے ہوئے ہے۔ ان چراغوں سے بعد کے افسانہ نگاروں نے کسب نور کیا اور پریم چند کے خیالات و تصورات کی ترجمانی اپنے افسانوں کے ذریعے کی۔

اردو افسانہ پریم چند کے بعد

پریم چند کے بعد اردو افسانہ نگاروں میں ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک کے مصنفین کے نام نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین بیسویں صدی کے اوائل میں سیاسی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے "انگارے" کے پس منظر میں اس دور کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"بیسویں صدی کے اوائل میں اپنی ابتدا ہی سے افسانہ میں یلدرم کے ہاتھوں جس رومانیت اور پریم چند کے ہاتھوں مثالیت پسندی کے باوصف جس حقیقت نگاری کی بنیاد پڑی تھی وہ الگ الگ باقاعدہ رجحان بن کر مستحکم روایتیں بن چکی تھیں "انگارے" اور پھر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر حقیقی زندگی پر زیادہ توجہ دی جانے لگی تھی۔ سماجی انتشار، قومی اتحاد، سیاسی بیچارگی طبقاتی استحصال، امن کی خواہش غربت اور افلاس متوسط طبقے کی اخلاقی اقدار کا کھوکھلاپن محبت پر پابندی، بیکاری، جنسی گھٹن، ایثار، قربانی کی لگن، خاندانی زندگی کی ابتری، اور ایسے ہی دوسرے موضوعات سینکڑوں شکلوں میں افسانے بنے۔"[1]

وقار عظیم "انگارے" کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:۔

"انگارے مغرب کے فن اور مشرق کی زندگی کے چھوٹے بڑے بہت سے اہم مسائل کا فنی امتزاج ہے۔ انگارے کی کہانیوں میں ہندوستان کی مذہبی، سیاسی اور سماجی زندگی اور ان سب کی پیدا کی ہوئی عجیب وغریب شخصیتوں اور ذہنیتوں کی تیکھی تصویریں بھی جن میں رو رعایت کہیں

---

[1] احتشام حسین "عکس اور آئینے" ۱۹۶۲ء ص ۱۳۴۔

نہیں اور آزادی اور بیباکی، خیال ہر جگہ ہے۔ ان کی مصوری میں تلخ
طنز اور شدید احساس کی رنگ آمیزی ہے۔ اور اس تلخ طنز میں کہیں
کہیں سنجیدگی اور ادبی اشاروں کے طرز کو چھوڑ کر تسخر اور جھنجلاہٹ
اور بعض جگہ ابتذال کی شکل اختیار کرلی ہے۔[1]

انگارے کی اشاعت کے فوراً بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ وہ دور ملک میں قومی بیداری اور قومی شعور کا دور تھا۔ ملک کے سیاسی اور معاشی حالات اور برطانوی عملداری کے سخت رویوں نے ادیبوں اور تخلیق کاروں کے احساس کو جھنجھوڑا۔ بین الاقوامی سیاست نے بھی ہندوستان کی سیاست کو براہِ راست متاثر کیا اور ادھر لوگوں کی توجہ انقلاب روس، فاسزم اور اس کے ساتھ دوسری جنگ عظیم کے امکانات نے ہندوستان کے عوام کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا۔ یورپ اور امریکہ کے دانشور بھی ایک پلیٹ فارم پر آ گئے۔ اور متحد ہو کر عوامی تحریکوں میں حصہ لینے لگے۔ اس کے اثرات سے ہندوستان کے نوجوان، جو انگلینڈ کی مختلف دانش گاہوں میں زیرِ تعلیم تھے۔ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان نوجوانوں نے ایک ادبی حلقہ تشکیل کیا ان میں سجاد ظہیر، محمد دین تاثیر، محمد علی، ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش اور پرمود سین گپتا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منعقدہ اپریل ۱۹۳۶ء لکھنؤ میں جو اعلان نامہ منظور کیا گیا اس کو ذیل میں نقل کیا جارہا ہے:۔

"ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین روایتوں کے وارث ہونے کا دعویٰ
کرتے ہیں اس لئے زندگی کے جس شعبے میں ردِ عمل کے آثار پائے جائیں
گے، انہیں اختیار کریں گے۔

ہم اپنی انجمن کے ذریعے سے ہر ایسے جذبہ کی ترجمانی کریں گے جو
ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام
میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم

---

[1] وقار عظیم "نیا افسانہ" ص ۶۳۔

چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل
کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل
ہیں۔ ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، پستی اور توہم
پرستی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوتِ تنقید
کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور ارادوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں
تغیر اور ترقی کے ذریعے سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔
انجمن کے مقاصد ہوں گے۔

(۱) تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشاورتی
جلسے منعقد کر کے اور لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

(۲) ترقی پذیر مضامین لکھنے —— اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ
افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کر کے اہلِ
ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

(۳) ترقی پسند مصنفین کی مدد کرنا۔

(۴) آزادیِ رائے اور آزادیِ خیال کی حفاظت کرنا۔[1]

انجمن ترقی پسند مصنفین نے ابتدا ہی سے سیاست کے ساتھ براہِ راست اپنا رشتہ جوڑ
لیا تھا۔ بہت سے نوجوان ترقی پسند ادیب سیاست میں عملی حصہ لیتے تھے۔ کیونکہ ترقی پسند
تحریک کا ایک مقصد رجعت پسند طاقتوں کے خلاف جدوجہد اور ملک کی آزادی کے لئے
کوشش کرنا تھا۔

سجاد ظہیر جو ترقی پسند تحریک کے محرک تھے انہوں نے ایک کتاب "روشنائی" کے نام
سے تصنیف کی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے ترقی پسند تحریک کا تعارف کرانے کے ساتھ
ساتھ تحریک کے اغراض و مقاصد اور اس کی تاریخ بھی بیان کی ہے۔ سجاد ظہیر "روشنائی"
میں ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

---

[1] ہنس راج رہبر "ترقی پسند ادب" ایک جائزہ، ۱۹۶۷ء ص ۲۲-۳۲۱

"ترقی پسند ادبی تحریک کا رُخ ملک کے عوام کی جانب، مزدوروں، کسانوں، اور درمیانہ طبقہ کی جانب ہونا چاہیئے۔ ان کو لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور، حرکت، جوشِ عمل اور اتحاد پیدا کرنا اور ان تمام آثار اور رجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود، رجعت اور پست ہمتی پیدا کرتے ہیں۔ ہم شعوری طور پر اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد اور وطن کے عوام کو اپنی حالت سدھارنے کی تحریکوں میں حصہ لیں۔ صرف دور کے تماشائی نہ ہوں۔ ترقی پسند ادیب کے دل میں نوع انسان سے اُنس، اور گہری ہمدردی ضروری ہے۔ بغیر انسان دوستی، آزاد خواہی اور جمہوریت پسندی کے ترقی پسند ادیب ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے ہم اعلانیہ طور پر ترقی پسند ادبی تحریک کا رشتہ آزادی اور جمہوریت کے ساتھ جوڑنا چاہتے ہیں کہ ترقی پسند دانشور مزدوروں اور غریب کسانوں اور مظلوم عوام سے ملیں۔ ان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا حصہ بنیں۔"[1]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ جہاں ترقی پسند تحریک کا مقصد زبوں حالی اور درمیانہ طبقہ کی حمایت، سماجی استحصال کی مخالفت اور سماج میں پھیلی ہوئی بے چینی کو دور کرنا تھا وہاں اس کا ایک اور اہم مقصد انگریزوں کی مخالفت اور آزادی کی حمایت تھا۔

انجمن کی کُل ہند کانفرنس دوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۴۲ء میں دہلی میں منعقد ہوئی۔ ترقی پسند مصنفین جمہوری حقوق کی حمایت میں اپنی آواز بلند کر چکے تھے اس اجلاس میں ترقی پسند ادیبوں کی جانب سے ایک قرارداد پیش کی گئی اور اس قرارداد میں کہا گیا کہ :-

"ہم برطانوی سامراج کے اس رویے کی مذمت کرتے ہیں کہ وہ اِن

---

[1] سجاد ظہیر "روشنائی" - لاہور ایڈیشن ص ۷۷ - ۷۸۔

نازک حالات میں ہمارے وطن کو آزادی دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔[1]

حسرت موہانی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی اہمیت اور اس کے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمارے ادب کو قومی آزادی کی ترجمانی کرنی چاہیئے۔ اسے سامراجیوں اور ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنی چاہیئے اور عام مظلوم انسانوں کی طرف داری اور حمایت کرنی چاہیئے۔ اس میں عوام کے دکھ سکھ، ان کی بہترین خواہشوں اور تمناؤں کا اس طرح اظہار کرنا چاہیئے جس سے ان کی انقلابی قوت میں اضافہ ہو اور وہ متحد اور منظم ہو کر اپنی انقلابی جدوجہد کو کامیاب بنا سکیں۔"[2]

پریم چند کی افسانہ نگاری اور "انگارے" کی اشاعت کے بعد ترقی پسند تحریک نے بھی اردو افسانے کو بہت متاثر کیا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے سماجی سیاسی اور معاشی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ پریم چند کے بعد کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور سہیل عظیم آبادی کے نام خاص ہیں۔

افسانہ نگاروں میں پریم چند کے بعد سب سے زیادہ معتبر نام کرشن چندر کا ہے۔ کرشن چندر نے ناول اور افسانہ دونوں میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان کے افسانوں میں، خوبصورت منظر، فطرت کی عکاسی کے ساتھ ساتھ سماج کی تلخ حقیقتوں نیز سیاسی حالات وواقعات کی بھرپور تصویر کشی ملتی ہے۔ معین عقیل نے کرشن چندر کے موضوعات اور رجحانات کے بارے میں لکھا ہے:۔

"کرشن چندر کے انقلابی رجحانات کے زیر اثر جنگ، سامراج اور فسطائیت بھی موضوع بنے ہیں اور ان کی موضوعات میں سماجی معاشی اور سیاسی زندگی کے مختلف پہلو شامل ہیں۔ ایک مخصوص سماجی اور سیاسی ماحول میں رہ کر ایک مخصوص نظریئے کے تحت انہوں نے افسانے لکھے ہیں۔ انکی

---

[1] سجاد ظہیر "روشنائی" ص ۲۸۷۔
[2] ص ۱۳۱۔

تحریروں میں ہمیں جو ماحول ملتا ہے وہ سیاسی طور پر غلام اور سماجی طور سے پس ماندہ ہے اور ان دونوں کے اسباب انگریز قوم اور سرمایہ دارانہ نظام ہیں۔ ہر طرف بھوک ہے، قحط ہے اور غلامی ہے۔ ہر افسر ایک ظالم اور سفاک افسر ہے۔ جسے اس ملک کے عوام سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یہ ماحول کرشن چندر کو انسان دوستی اور سماجی رشتوں کو سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ چنانچہ انکی انسان دوستی بعد میں گہری سے گہری رومانی فضا میں بھی انسانیت کی آزادی کے پرچم کو بلند رکھتی ہے۔ وہ اپنے رومانی انداز میں انسانیت کی آزادی اور محبت کی آزادی کو ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ جب وہ سماجی رشتوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس بڑی حکمراں طاقت کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں جس نے زندگی اور فطرت دونوں ہی کے حسن پر قبضہ جمالیا تھا۔ کرشن چندر نے انسان دوستی اور غلامی کے خلاف شدید نفرت کے اظہار سے انسان کی آزادی اور ہندوستان کی آزادی کے پرچم کو ہمیشہ بلند رکھا ہے[1]

۱۹۳۶ء کے بعد افسانہ نگاروں نے جو افسانے تخلیق کئے ان میں کرشن چندر کا افسانہ "دو فرلانگ لمبی سڑک" احمد علی کے افسانے "ہماری گلی" اور "میرا کمرہ" منٹو کا "نیا قانون"۔ حیات اللہ انصاری کا افسانہ "آخری کوشش" موضوع اور فن کے اعتبار سے بہترین افسانے تصور کئے جاتے ہیں۔

ان سے ذرا آگے بڑھ کر احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، ابراہیم جلیس، اختر اورینوی، حسن عسکری، بلونت سنگھ، اپندر ناتھ اشک اور خواجہ احمد عباس کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

احتشام حسین اس دور کے ادیبوں کی نگارشات کا جائزہ لیتے ہوئے "روایت اور بغاوت" میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] تحریک آزادی میں اردو کا حصہ۔ ص ۷۷، ۷۶

"اس زمانہ میں اُردو ادیبوں کی کاوشوں میں تین خواہشات کی جھلک واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ ہندوستان کا جسم زخمی نہ کیا جائے۔ فرقہ واریت انگریز سیاست کی ناجائز اولاد ہے اس کا گلا گھونٹ دیا جائے اور اگر ہندوستان کی تقسیم ہونا ہی ہے تو مہاتما گاندھی کے الفاظ میں اس کی تقسیم اس طرح ہو کہ جیسے بھائی بھائی اپنی ملکیت تقسیم کرتے ہیں یعنی یہ تقسیم انگریزوں کے ہاتھوں سے نہ ہو بلکہ آپس کے سمجھوتے کا نتیجہ ہو[1]"

پریم چند اور کرشن چندر کے بعد افسانہ نگاری کی دنیا میں ایک اور معتبر نام سعادت حسن منٹو کا ہے۔ منٹو ایک اعلیٰ پائے کا افسانہ نگار تھا۔ اس کا فنی شعور اور اصابت فکر، رجحانات اور خیالات اپنے معاصرین سے مختلف ہیں۔ ایک طرف منٹو نے جنسی مسائل اور معاملات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے تو دوسری طرف اپنے عصری سیاسی مسائل سے بھی باخبر نظر آتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں سیاسی مسائل سے بھی بحث کرتا ہے۔

معین عقیل منٹو کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"منٹو کا فنی شعور افسانہ نویسی کے لئے زیادہ موزوں تھا۔ ان کے عام افسانوں میں طوائف کی زندگی اور جنسی الجھنوں سے دوچار نوجوانوں کے علاوہ ہندوستان کی سیاسی بیداری کے مناظر، سیاسی جلسے، جلوسوں پر پولیس کی گولہ باری، گلیوں بازاروں میں مسلح فوج کا راج، جیل خانے، مارشل لاء، بغاوت کو ختم کرنے والی برچھیاں اور گولیاں، ایک نئے قانون کی خواہش، انقلاب کے نعروں کی گرماگرمی جیسے موضوعات بکثرت ملتے ہیں۔ ان کے بے شمار موضوعات میں خصوصیت سے ہندوستان کی سیاسی زندگی کی منظر کشی ہے[2]"

منٹو نے ایک خاص دور کے سیاسی معاملات و کوائف کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ان کے جن افسانوں کو خاص اہمیت حاصل ہے اور جو سیاسی حالات کے مکمل طور پر ترجمان ہیں۔ ان میں "نیا قانون" "نعرہ" "شرابی" "تماشا" "ماتمی جلسہ" "دیوانہ شاعر" "سوراج کے لئے" خاص ہیں۔

---

[1] احتشام حسین "روایت اور بغاوت" ۱۹۶۶ء ص ۱۷۹۔ [2] تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص ۳۷۷۔

منٹو کا افسانہ "تماشہ" ۱۹۱۹ء کے مارشل لاء کے ہنگاموں کو پیش کرتا ہے۔ "شرابی" اس کے بعد کے واقعات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں منٹو نے تحریک عدم تعاون کی جدو جہد اور اس کے نتیجے میں افراد کی گرفتاری اور ان کی رہائی کے بعد کی زندگی کے سیاسی انداز اور صورت حال کو پیش کیا ہے۔ افسانہ "شرابی" کے چند اقتباسات ذیل میں نقل کئے جا رہے ہیں۔

"آہ آزادی..... خدا معلوم اس کا ذائقہ کس قدر لذیذ ہو گا۔ ان آزاد لوگوں کی حالت پڑھتا ہوں تو مجھے ایک افسانہ سا معلوم ہوتے ہیں۔ میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہم بھی کبھی آزاد ہوں گے..... اس کا جواب مجھے نہیں ملتا۔[1]"

افسانہ نگار اپنی غلامی، بے بسی، اور مظلومی کا احساس اس طرح بیان کرتا ہے۔

"قصور وار ہر حالت میں وہ لوگ ہیں جو ہماری گردنوں پر ظلم کی تلوار لئے کھڑے رہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا "ہندوستان کے ۲۵ کروڑ باشندے اپنی چھپی ہوئی آزادی حاصل کر لیتے اگر ظلم کا کٹا ہاتھ ان کی گردنوں کو نہ دبائے ہوتا۔ وہ ڈراتے ہیں اور ہم اس لئے ڈر جاتے ہیں کہ ہمارے جسم کا ہر عضو ان کے ظلم سے مفلوج ہے.....[2]"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس ٹڈی دل پر کتنے لوگ حکومت کر رہے ہیں آپ ان کو انگلیوں پر گن سکتے ہیں..... حاکم ہر گز ملعون و مطعون نہیں ہو سکتے ہمارا وطن خوف میں لپٹا ہوا ہے۔ اس دھند کو دور کر دیجئے پھر آپ کو ہر چیز روشن نظر آئے گی۔[3]"

منٹو کے افسانے "نیا قانون" کا مرکزی کردار منگو کوچوان ہے۔ جو غیر تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی عصری حالات سے باخبر اور سیاسی طور پر بیدار نظر آتا ہے۔ منگو انگریزوں سے سخت نفرت کرتا ہے۔ افسانے میں ایک جگہ منگو انگریزوں کے بارے میں کہتا ہے۔

"(انگریز) آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک بن گئے۔ ناک میں دم کر رکھا

---

[1]، [2]، [3] منٹو افسانہ "شرابی"

ہے ان بندیوں کی اولاد نے ۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں ...... لے"

پروفیسر محمد محسن اپنی کتاب "منٹو اپنی تخلیقات کی روشنی میں" ملک کے سیاسی تناظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے منٹو کی افسانہ نگاری کا جائزہ اس طرح لیتے ہیں :۔

" ملک میں آزادی کی لہر تیزی سے پھیل رہی تھی، ملک کی غلامی کو غربت، جہالت، بیروزگاری اور ساری دوسری اقتصادی اور اخلاقی گراوٹوں کا سبب قرار دیا جانے لگا تھا۔ منٹو بھی ان عصری تقاضوں سے متاثر ہوا اور اس نے چند اچھے افسانے بھی لکھے جن کا مقصد سیاسی اور سماجی بیداری کی اس لہر کو ہوا دے کر عوام کے دلوں میں بغاوت کے جذبات کو بھڑکانا تھا۔ ؎"

منٹو نے جہاں ایک طرف اپنے افسانوں میں جنسی مسائل سے بحث کی وہاں انہوں نے آزادی کی تحریکات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے افسانوں میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ، احتجاجی جلسے، آزادی کے متوالوں پر مظالم اور آزادی کی تڑپ محسوس کی جاسکتی ہے۔ منٹو کے اس طرح کے افسانوں میں "نیا قانون"، "نعرہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "سوتری" ہندوستان کی تقسیم پر ایک فنکارانہ طنز ہے۔ منٹو کے بیشتر افسانے سیاسی اور سماجی ناہمواری بے راہ روی اور ناانصافی پر ان کے تاثرات پیش کرتے ہیں۔

اردو افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاست کے بھی گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔

بقول معین عقیل :۔

" احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں جو ماحول پیش کیا ہے وہ بڑا وسیع ہے اس میں زندگی کچھ محدود نہیں۔ اس کی معاشرتی، اخلاقی اور معاشی زندگی پر ملکی سیاست اور بین الاقوامی سیاست اور معاشیات کا اتنا گہرا رنگ

لے منٹو افسانہ "نیا قانون"۔ ؎ محمد محسن "منٹو اپنی تخلیقات کی روشنی میں" ۱۹۸۲ء ص ۱۲۱۔

چڑھا ہوا ہے کہ انہیں مجرد حالت میں دیکھنا ممکن نہیں۔ ان کے افسانوں میں پنجاب کے دیہات کے مخصوص رومانی مناظر اور اس کی زندگی کی روح اور مرکز چوپال کے علاوہ انقلاب زمانہ، عصری تحریکات خصوصاً خلافت تحریک، انقلاب و آزادی کی جدوجہد، ایسے موضوعات ہیں جن کا افسانوں میں گہرا عکس موجود ہے۔"[1]

احمد ندیم قاسمی نے خصوصاً پنجاب کے دیہاتوں کی رومانی فضا کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ انہوں نے اپنے دور کی تحریکوں بالخصوص آزادی کی جدوجہد کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان کا افسانہ "ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد" دوسری جنگ عظیم کے حالات و کوائف کے پس منظر میں تخلیق کیا ہوا ہے۔

ابراہیم جلیس نے بھی سیاسی حالات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے غیر ملکی ناجائز سیاسی اقتدار کو ختم کرنے کا نعرہ لگایا۔ اور ملک میں پھیلی ہوئی معاشی بدحالی کا ذمہ دار بھی انگریز کو قرار دیا۔ جلیس کے اس طرح کے افسانوں میں "چالیس کروڑ بھکاری"، "رذیل"، "زرد چہرے"، "نکونا دیس"، "ہندوستان چھوڑ دو"، "اونچی ایڑی کی گرگابی"، "ہمیں امن نہیں چاہیئے"، "بنارس کی ساڑی"، "عریاں"، "تیری اور میری آنے والی نسل" ایسے متعدد افسانے ہیں جن میں انگریز عملداری کے ظلم و استبداد، فرقہ واریت، کسانوں کے استحصال کی سخت مخالفت کی گئی ہے اور جو اپنے عہد کے سیاسی اور معاشی حالات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی پریم چند سے لے کر ترقی پسند تحریک تک اردو کے تقریباً تمام افسانہ نگاروں نے عصری سیاسی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور آزادی کی تحریک میں ایک نئی روح پھونکی۔

---

[1] تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ۔ ص۔ ۵۸۔

تحریکِ آزادی

۹۱

اردو ڈرامہ

اُردو کی نثری اصناف میں ڈرامہ بھی ایک مقبول صنفِ ادب ہے۔ اگرچہ اُردو میں ڈرامے کی روایت زیادہ وسیع نہیں ہے۔ عشرت رحمانی کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ:۔

"ڈراما یونانی زبان کے لفظ ڈراؤ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں عمل یا ایکشن، ہر ملک اور ہر زبان کی تعریف کے مطابق ڈراما انسانی زندگی کی عملی تصویر مانا گیا ہے۔ قدیم زمانے سے لیکر آج تک فنی اصطلاح میں ڈراما کا اطلاق اس صنفِ ادب پر ہوتا ہے جس کے الفاظ میں گفتار کی متحرک قوت اور کردار میں عمل اور ارادہ کی کیفیت موجود ہو۔ عملی تجربات کی روشنی میں ثابت ہو چکا ہے کہ "ڈراما" ادبیات عالم میں منفرد صنف ہے۔"[1]

ڈرامے کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں پارسیوں کی کوششوں کا بڑا دخل رہا ہے لیکن ان کا مقصد خالص تجارتی تھا۔ اس لئے ابتدائی ڈراموں میں ملکی و قومی مسائل سے بحث اور سماجی کشمکش نظر نہیں آتی۔ البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے تخلیق کئے ہوئے ڈراموں میں ملکی اور قومی جذبہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔

ڈرامہ کا اسٹیج سے گہرا تعلق ہے اس لئے ڈرامہ اور اسٹیج ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں کیونکہ اسٹیج کے بغیر ڈرامہ کا تصور ممکن نہیں۔ موجودہ دور میں ڈرامے اسٹیج کرنے کا رواج کم ہوتا جا رہا

---

[1] عشرت رحمانی "اُردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید"۔ ص ۲۰۵۔

ہے اس لئے ڈرامے بھی کم تخلیق کئے جا رہے ہیں۔

موضوعِ زیرِ بحث کے تعلق سے انہیں نمائندہ ڈراموں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں قومی اور سیاسی شعور زیرِ بحث رہے۔ اس طرح کے ڈراموں میں اس دور کے سیاسی حالات سے بحث اور ملک میں قومی شعور کی بیداری کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا گیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جن ڈرامہ نگاروں نے خاص طور پر مقبولیت اور شہرت حاصل کی ان میں آرام، رونق بنارسی، حافظ عبداللہ، حسینی میاں ظریف، طالب بنارسی اور احسن لکھنوی کے نام امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

عشرت رحمانی "اُردو ڈرامہ کی تاریخ و تنقید" میں ۱۸۵۷ء کے بعد کی ڈرامہ نگاری کا سیاسی پس منظر بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد قومی اور سیاسی بیداری کے دور میں طویل سیاسی جد وجہد کے دوران کئی ڈرامہ نگاروں نے سیاسی موضوعات اور مسائل پر ڈرامے تخلیق کئے۔ یہ ڈرامے عصری سیاسی تقاضوں کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آئے تھے۔ ان میں سیاسی جذبات و احساس اور شعور عام نظر آتا ہے۔ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار اور قومی بیداری کے مقاصد معلوم ہوتے ہیں ان میں سے اکثر ڈرامے عوام میں بے حد مقبول ہوئے اور اس زمانے کی تھیٹر کمپنیوں نے جگہ جگہ انہیں اسٹیج کیا۔ ان میں سے بعض ڈراموں کے سلسلے میں حکومت نے کئی کمپنیوں کے خلاف کاروائی بھی کی۔ بھاری جرمانے کئے اور کمپنیاں ضبط ہوئیں [۱]۔"

"تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ" میں معین عقیل لکھتے ہیں:۔

"بعض ڈراموں میں محض سیاسی واقعات و حالات پیش کئے گئے ہیں اور بعض میں کھل کر برطانوی مظالم، سیاسی جبر و استبداد اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کو دکھایا گیا ہے اور چند ڈراموں میں آزادی کی اہمیت، حصولِ آزادی کی ترغیب اور برطانوی حکومت سے نجات جیسے موضوعات اور

---

[۱] عشرت رحمانی "اُردو ڈرامہ کی تاریخ و تنقید"۔ ص ۲۰۸۔

خیالات بیان کئے گئے ہیں۔"[1]

اُردو میں تو متعدد ڈرامے تخلیق کئے گئے لیکن سیاسی ڈراموں میں اردو کا پہلا ڈرامہ "فرنگی اور ہندوستانی طرزِ حکومت" لکھا گیا۔ عبدالعلیم نامی نے اس ڈرامے کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ :-

"اُردو میں سیاسی موضوعات پر پہلا ڈرامہ "فرنگی اور ہندوستانی طرزِ حکومت" ہے جو ۱۸۵۷ء میں بمبئی میں اسٹیج کیا گیا۔"[2]

"فرنگی اور ہندوستانی طرزِ حکومت" کے بارے میں کوئی مزید معلومات فراہم نہیں ہو سکی۔ اس کے کافی عرصہ بعد ۱۸۹۳ء میں امداد علی لکھنوی نے 'البرٹ بل' کے نام سے ایک ڈرامہ تخلیق کیا۔ اس ڈرامے میں ابتدا سے آخر تک برطانوی حکومت کے مظالم، جور و ستم اور جبر و استبداد کو دکھایا گیا ہے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو کس کس طرح اپنی فریب کاریوں سے غلام بنائے رکھا اس داستان کو بھی دہرایا گیا ہے، اور انگریزوں کو متکبر، متعصب اور ظالم قرار دیا گیا ہے۔ اسکے کرداروں میں مسٹر ہارش، مسٹر پریجوڈس، مسٹر اینگر، مسٹر براوڈ، کو اسم بامسمّٰی دکھایا گیا ہے۔ ڈرامہ کے آخری حصہ میں ہندوستانیوں کو سرخ رو اور فتحیاب دکھلاتے ہوئے ترمیم شدہ "البرٹ بل" وائسرائے کی کونسل منظور ہونے کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

اُردو کا اہم ڈرامہ مولانا ظفر علی خاں نے "جنگ روس و جاپان" تصنیف کیا تھا۔ اس ڈرامے کے بارے میں معین عقیل رقمطراز ہیں :-

"یورپ کی آخری انیسویں صدی کی جنگی حکمت عملی کو "مرض جوع الارض" قرار دیا ہے۔ ظفر علی خاں نے جاپانیوں کی قوم پرستی کے ذکر سے ہندوستانیوں کو سبق حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اس میں ایسے کردار پیش کئے گئے جو ہندوستانیوں کے لئے مثالی ہو سکتے ہیں۔ ضعیف، بیوہ ماں کا محض اس خیال سے خودکشی کرنا کہ اس کے بعد اس کا لڑکا ماں کی خدمت کے بجائے ملک و قوم کی خدمت کر سکے۔ اور اس نوجوان کا دھیان صرف ملک و قوم کی خدمت کی طرف رہے۔ طفل مکتب کا مدرسہ کے اوقات

---

[1] معین عقیل "تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ" ص ۵۸۹۔ [2] عبدالعلیم نامی اردو تھیٹر ۱۹۶۲ء جلد دوم ص ۳۰۰۔

کے بعد مٹھائی بیچکر جنگی فنڈ میں روپیہ دینا محکوم ہندوستانیوں کے لئے مشعلِ راہ ہوسکتا تھا۔ اس ڈرامے کے ذریعے یورپ کے مقابلہ میں ایشیا کی برتری کے احساس کو بیدار کرنا بھی تھا۔ جو فی الواقعی جاپان کی روس کے مقابلہ میں فتح ۱۹۰۵ء کے بعد ایشیا میں پیدا ہو رہا تھا۔[1]

اس کے علاوہ متعدد ایسے ڈرامے تخلیق کیے گئے جن میں حب الوطنی اور ملک وقوم کی خدمت کا جذبہ اور لگن پائی جاتی ہے۔ مثلاً اصغر نظامی کے ڈرامے "قومی دلیر" سے ہندو مسلم اتحاد و یگانگت جھلکتی ہے۔ عبدالطیف نے "ہمارا گھر" تصنیف کیا تھا۔ اس ڈرامہ کا مرکزی کردار ہندو ہونے کے باوجود مسلمانوں سے بے پایاں محبت کرتا ہے۔ اور قومی یکجہتی و یگانگت میں یقین رکھتا ہے۔ وہ اپنا تمام سرمایہ سوراج اور خلافت فنڈ کو دے دیتا ہے۔ اسی طرح عباس علی نے "لیڈی جوتنی" اور "شاہی فرمان عرف دیش ایدیش" تخلیق کئے۔ آخر الذکر ڈرامے کا مرکزی کردار رام ناتھ اخبار "ہندو درپن" کا ایڈیٹر ہے۔ رام ناتھ انگریزوں کی بد عنوانیوں اور حکمت عملی کی خامیوں پر تنقید کرتا ہے۔ محشر انبالوی کا ڈرامہ "غریب ہندوستانی عرف انقلاب یعنی سودیشی تحریک" ہے۔ انہوں نے اس ڈرامے میں ہندو مسلمانوں کے سیاسی اور قومی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے کردار ہری پانڈے اور شیو پانڈے ہندوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں اس طرح کے موضوعات پر ریاض دہلوی نے "مسلم پجاری" میں اور نصیر انبالوی نے "وطن" میں پیش کئے ہیں۔

دل لکھنوی کا ڈرامہ "تاج محل" ہندو مسلم یگانگت اور یکجہتی پر مبنی ہے۔ ایک دوسرے ڈرامے "وطن" میں ہندوستانیوں کی جدوجہد آزادی کو پیش کیا ہے۔ شمس لکھنوی کے ڈرامے "مادر وطن" اور "حب الوطن" خاص ہیں۔ انہوں نے ان ڈراموں میں حب الوطنی کے جذبات کو نمایاں کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ وطن کی محبت ہر ہندوستانیوں کا فرض ہے اور غلامی سے نجات کے لئے ہندوستان کے ہر فرد کو جدوجہد کرنی چاہیئے۔

محی الدین عزم کا ڈراما "دیش کی پکار" ایک اہم ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامے کے ذریعے انہوں نے ہندوستانی عوام کے قومی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ "گوشہ افلاس

---

[1] معین عقیل "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" ص ۵۹۰۔

عرف خونِ حسرت" کے عنوان سے وحشت دہلوی نے ایک ڈرامہ تصنیف کیا تھا۔ اس میں انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت کی ہے۔ وحشت دہلوی نے اس ڈرامے میں سرمایہ داروں کے مظالم اور عوام کی زبوں حالی کو پیش کیا ہے۔

"بیداری" اظہر دہلوی کا اہم ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامے میں آزادی کی تحریکوں کا پورا سیاسی تناظر پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً تحریک عدم تعاون کی حمایت، تحریک خلافت، جلیانوالہ باغ کا سانحہ، مارشل لاء، سودیشی تحریک کے مختلف واقعات اور ان کے عواقب بیان کئے گئے ہیں۔ اور ہندوستان کے عوام کو آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے اور قربانیاں پیش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

مثال کے طور پر اظہر دہلوی کے ڈرامے "بیداری" کے چند اقتباسات ذیل میں پیش کئے جارہے ہیں۔

"امرت: جلیانوالہ باغ کی زمین لالہ زار بنادی گئی ہے۔ بے گناہ اور نہتے ہندوستانیوں کو مشین گنوں کا نشانہ بنادیا گیا۔ مسلمان بھائیوں کی خلافت پارہ پارہ کردی گئی اور ان کی فریاد مطلق نہیں سنی گئی۔

بخشی: "بے شک عدم تعاون ہی ہمارے درد کا علاج ہے۔ عدم تعاون کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک کہ قاتلانِ جلیانوالہ باغ کو عبرت انگیز سزا نہیں دی جائے گی۔ اور جب تک خلافت کا فیصلہ مسلمانوں کے خیال کے مطابق نہیں کیا جائے گا۔"

امرت: "مگر یہ باتیں سوراج کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتیں۔"

بخشی: "بے شک نہیں ہوسکتیں۔ اسی لئے کانگریس اور مسلم لیگ نے سوراج کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔"[1]

سردار جعفری کا ڈرامہ "یہ کس کا خون ہے" پانچ ایکٹ پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامے میں ہندوستانیوں کی جدوجہد، شجاعت اور بہادری کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں بھیم اور ارجن، اکبر اور ٹیپو، جھانسی کی رانی، اور بھگت سنگھ کی روح ہے۔

---

[1] اظہر دہلوی "بیداری" بحوالہ "نوائے آزادی" مرتبہ عبدالرزاق قریشی ۱۹۵۷ء ص ۱۹۵۔

ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر ڈراموں کا ایک مجموعہ "نئی تصویریں" سجاد ظہیر نے مرتب کیا تھا ان ڈراموں میں "ہیلڈ رک" ہے جس میں دوسری جنگ عظیم کے واقعات ہندوستان کے حوالے سے بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرا ڈرامہ "مارشل تمونکو" ہے اور تیسرا ڈرامہ "لال جھنڈا" ہے۔

لالہ کشن چند زیبا کا ڈرامہ "شہید وطن" موتی لال نہرو کی زندگی پر محیط ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ موتی لال نہرو اپنے پورے خاندان کے ساتھ اپنی زندگی ملک و قوم کی خدمت میں صرف کر دیتے ہیں۔ اور گاندھی جی کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیتے ہیں۔ شہیدِ وطن کے دیباچے میں یہ اشعار درج ہیں۔

پرورش کیا کیا کیے گوہر زمینِ ہند نے
کیسے کیسے لال اگلے سرزمینِ ہند نے

روشنی خورشید نے لی جن کی آب و تاب سے
ہے غلامی کو بھی سکتہ جن کے رعب و داب سے

نور الٰہی محمد عمر کا ڈرامہ "روحِ سیاست" پنڈت نہرو اور ابراہم لنکن کی سیاسی جدوجہد پر مشتمل ہے اس میں دونوں کی ملکی، سیاسی اور ملی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔

اشتیاق حسین قریشی کا ڈرامہ "نقشِ آخر" جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے واقعات پر مبنی ہے۔ ڈرامہ کا مرکزی کردار میر عاشق، رشیدہ، محسن اور دیگر لوگ گفتگو میں منہمک رہے ہیں۔ نرگس (میر عاشق کی خانہ زاد) داخل ہوتی ہیں اور خبر دیتی ہے۔

"حضور چھوٹے سرکار (میر ناصر) تشریف لائے ہیں۔"

میر ناصر اندر جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"سنا ہے کہ انگریزوں نے پورے ہندوستان کو کرسٹان بنانے کی ٹھان لی ہے۔ کارتوسوں پر چربی لگائی ہے اور ہندوستانیوں کو اسے منہ میں رکھنا پڑتا ہے۔ تلنگوں نے بغاوت کا ارادہ کر لیا ہے۔"[1]

---

[1] اشتیاق حسین قریشی "نقشِ آخر" ص ۱۵۔

میر عاشق اور میر ناصر میں گفتگو جاری ہے۔ میر ناصر کا کہنا ہے کہ انگریزوں کی دیسی سپاہ نے بغاوت کر دی ہے اور وہ دہلی کی طرف بہادر شاہ ظفر کے پاس پہنچ رہے ہیں۔

"ان باغیوں نے جھروکوں کے نیچے پہنچکر پرے جمائے اور با قاعدہ فوجی سلامی ادا کی۔ جہاں پناہ نے حکیم احسن اللہ خاں کو حکم دیا کہ استفسار حال کریں اور پوچھیں کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ اس پر ان کے افسر آگے بڑھے اور ہاتھ جوڑ کر تقریر کی جس کا مطلب یہ تھا کہ انگریزوں نے ان کے دین و آئین میں مداخلت شروع کر دی ہے اس وجہ سے وہ بغاوت پر مجبور ہیں۔"[1]

"نقشِ آخر" میں ۱۸۵۷ کے انقلاب کا پورا تناظر پیش کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی تباہی اور بربادی اور خصوصاً مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو تاخت و تاراج ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ نیز مسلمانوں میں قومی، سیاسی اور تعلیمی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پروفیسر محمد مجیب نے بھی بعض اہم ڈرامے تخلیق کئے۔ انہوں نے مقصدی اور اصلاحی ڈراموں کے علاوہ تاریخی ڈرامے بھی لکھے۔ پروفیسر مجیب کے ڈراموں میں "آزمائش" قابلِ ذکر ہے۔ مجیب صاحب کا ڈرامہ آزادیٔ ہند کے بعد یعنی جولائی سنہ ۱۹۵۷ء میں پہلی بار منظر عام پر آیا۔ اصلاً یہ ڈرامہ ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ڈرامے کو پڑھنے کے بعد ہندوستان کی جنگِ آزادی اور حریت پسندوں کے عزم و حوصلے کا پتہ چلتا ہے۔ اس ڈرامے کے بارے میں قمر اعظم "اردو ڈرامہ نگاری" میں لکھتے ہیں:-

"اس میں انگریزوں کے خلاف عوام اور فوجیوں کی بغاوت اور شہزادہ مرزا مغل کی رہبری نے وطن پرستانہ سرفروشی اور سرفروشانہ وطن پرستی کے سلسلے میں قومی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کی پوری وضاحت کر دی ہے۔ یہاں عقائد و عزائم، شدت و قوت کے ساتھ ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں۔ ان سے اثر انگیز مکالموں کے شعلے بلند ہوتے ہیں اور منزل و مقصد کے راستے روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان ڈرامائی واقعوں اور مکالموں میں ڈرامانگاری کی صرف معلومات ہی نہیں محسوسات بھی ہیں۔"[2]

---

[1] اشتیاق حسین قریشی "نقشِ آخر" ص ۲۳۔ [2] قمر اعظم "اردو ڈرامہ نگاری" ص ۲۶۔

آزمائش کا ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مرزا مغل: "کیوں کیا ہوا؟"

حکیم احسن اللہ خاں: "کیا بتاؤں زبان میں طاقت نہیں کہ بیان کر سکے۔ فرنگیوں کی گستاخیاں کیا کم تھیں آج اپنے ملک کی بیباکی دیکھ لی ...... میرٹھ کی فوج نے غدر کر دیا۔ وہاں مار دھاڑ کر کے باغی آج یہاں پہنچے۔ حضور اقدس سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کے بادشاہ بن جائیں[1]۔"

"آزمائش" کا پورا پس منظر سیاسی ہے جس میں انگریزوں کے معاندانہ رویّے اور عوام کے استحصال کے واضح نقوش ابھر کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

مذکورہ بالا ڈراموں میں سیاسی، سماجی صورت حال کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ یہ ڈرامے اس دور کے قومی اور سیاسی رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔ چند ڈرامہ نگاروں نے بڑی جرأت اور بیباکی کا ثبوت دیا اور ڈراموں میں واضح طور پر آزادی کا جذبہ اور مطالبہ پیش کیا۔

---

[1] پروفیسر محمد مجیب "آزمائش" ۱۹۵۶ء ص ۸-۷۔

تحریکِ آزادی

اور

اردو طنز و مزاح

اُردو نثر میں طنز و مزاح کا آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا۔ اس سلسلے میں غالب کے خطوط خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ غالب کے خطوط ہی نے اُردو نثر میں طنز و مزاح کی خشت اوّل رکھی۔ خطوط غالب کے بعد "اودھ پنچ" کے طنز و مزاح نگاروں نے اس میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اودھ پنچ کے قلم کاروں نے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے طنز و مزاح میں طبع آزمائی کی اور مختلف اسالیب کے ذریعے اس فن کو ارتقائی منزلوں تک پہنچایا۔

اودھ پنچ سے قبل ہجویات، شہر آشوب اور نظموں کی صورت میں طنز و مزاح کے نمونے ملتے ہیں۔ اودھ پنچ کا اجرا ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ اس اخبار کے مدیر منشی سجاد حسین تھے۔ جنہوں نے طنز و مزاح کے لکھنے والوں کا ایک حلقہ تیار کیا تھا۔ اس کے قلم کاروں نے زندگی کے ہر شعبے اور ہر جہت مثلاً سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی، اور تعلیمی مسائل اور معاملات کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس دور کے حکمراں طبقے اور انگریزوں کی عملداری کو ہدف طنز بنایا۔

"نقوش" لاہور جنوری، فروری ۱۹۵۹ء کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ:

"غدر کے بارہ سال بعد غالب کے خطوط اور نذیر احمد کی مراۃ العروس شائع ہوئے اور ان کے پانچ سال بعد ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" جاری ہوا۔ اودھ پنچ مشرق اور مغرب کے تصادم کا پہلا مظہر ہے۔[1]"

---

[1] خورشید الاسلام "طنز و ظرافت" مشمولہ نقوش لاہور طنز و مزاح نمبر، جنوری، فروری ۱۹۵۹ء ص ۱۸۔

اودھ پنچ کے بارے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں :-

" اودھ پنچ معاشرت میں قدامت اور سیاست میں جدیدیت کا قائل تھا۔ اودھ پنچ نے اپنی پالیسی کے ذریعے ملک و قوم کی خدمات ایسے وقت میں انجام دیں جب ہندوستان کے حریت پسند عوام اپنی آزادی اور تہذیب کی حفاظت کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ آسمان سیاست پر بے چینی اور انتشار کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اودھ پنچ نے ایسے ہی وقت میں ملک کے عصری تقاضوں کو پورا کیا۔ اس کے مدیر منشی سجاد حسین نے ملک کی آزادی میں حصہ لیا۔ اور ملک و قوم کی خدمت و تحفظ کے لئے متعدد سیاسی مضامین لکھے۔ منشی سجاد حسین بذاتِ خود کانگرسی ذہن رکھتے تھے اور اس دور میں جنم لے رہے سیاسی مسائل کو پیش کرنے کے لئے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت میں کچھ نہ کچھ سپرد قلم کرتے رہتے تھے [1]۔"

وزیر آغا "اودھ پنچ" کے عہد کے سیاسی تناظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

" اودھ پنچ اپنے زمانے کی انقلابی تبدیلیوں کے خلاف رد عمل کے طور پر نمودار ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۸۵۷ کے ہنگامے نے زندگی سے شگفتگی اور آسائش چھین لی تھی اور اس کے چہرے پر سنجیدگی کی تیوریاں پیدا کر دی تھیں۔ سیاسی، سماجی، اور ادبی ماحول میں سنجیدگی اور انہماک کا دور دورہ تھا۔ انتہائی پستی اپنے جوبن پر تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہر شخص اپنے طوفانی بہاؤ کے ساتھ ایک تنکے کی طرح بہتا چلا جائے گا۔ ایسے میں اودھ پنچ نے فرد کو روک کر اس کے ہاتھ میں آئینہ تھما دیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے اس میں اپنی صورت دیکھنے کی تکلیف گوارا کرے۔ جب اسے آئینے میں ایک انتہائی سنجیدہ چہرہ مضحکہ خیز حرکات کرتا نظر آیا تو فرد کو ندامت بھی محسوس ہوئی اور اس کے جوش و انہماک میں اعتدال پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اودھ پنچ نے قوم کے طوفانی دریا

---

[1] رشید احمد صدیقی ص ۱۲۰۔

کو کناروں سے چھلکنے اور یوں تباہی و بربادی پھیلانے سے بروقت روکنے کی انتہائی کوشش کی اور اس دریا سے طنز و ظرافت کی بے شمار چھوٹی چھوٹی نہریں نکال کر اس کی طغیانی میں دھیما پن پیدا کرنے کا قابلِ رشک کام سرانجام دیا ہے[1]۔

مذکورہ بالا اقتباس میں اودھ پنچ کے عصری سیاسی مسائل کا پورا تناظر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

وزیر آغا اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:۔

"اودھ پنچ کے ذریعہ تاریخی کام سجاد حسین کی مساعی کا رہین منت ہے۔ سجاد حسین خود بلا کے لکھنے والے تھے اور وہ آج بھی حاجی بغلول، طرحدار لونڈی، اور احمق الدین کے مصنف کی حیثیت سے مقبول خاص و عام ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ انہوں نے جو خط ہندوستانی رؤسا کے نام لکھے وہ بھی انتہائی دلچسپ اور طنزیہ انداز میں لکھے ہیں۔ علاوہ ازیں اودھ پنچ میں "لوکل" اور "موافقت زمانہ" کے زیرِ عنوان ان کے جو مضامین چھپے تھے ان میں ملک کے سیاسی، موسمی اور سماجی حالات پر وہ بڑی دلیری سے طنز کرتے تھے[2]۔"

سجاد حسین نے متعدد سیاسی اور سماجی مضامین سپرد قلم کئے نیز ان مضامین میں اپنے عہد کے سیاسی مسائل سے بھی بحث کی۔ سجاد حسین کے مضامین میں "انڈے، بچے والی چیل چلہار" عوام و خواص میں ازحد مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ کھلے خط سربستہ مضامین نیچر کا مارشل لاء، مٹی خراب خلق میں مہر و وفا کی ہے، ہڈیوں پر میری لڑتے ہیں، جھنجھٹ کا یہ مزہ ہے، کہ ہوں وہ بھی بے قرار، پروفیسر اودھ پنچ کے پولٹیکل اقلیدس، بے مارکی توبہ، ٹیکس کی دم، ابر کا مل اور سرکار انگلشیہ، منھ لگائے ڈومنی گائے تال بے تال، یہ مبارک جنگ کا چندہ ہے، پولٹیکل باغ و بہار یعنی قصہ چہار درویش، قانون اور اس کا دم ترمیم وغیرہ مضامین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ سجاد حسین کانگریس کے حامی تھے اور آخر تک کانگریس کے علمبردار رہے۔ اس لئے انہوں

---

[1] وزیر آغا "اردو ادب میں طنز و مزاح" ۱۹۵۸ء ص ۱۶۳-۱۶۲، [2] ایضاً
[2] ایضاً ایضاً ایضاً ۱۶۴۔

نے طنز و مزاح کے پیرائے میں برطانوی حکومت کی کوتاہیوں اور بدعنوانیوں کا پردہ ایسے دور میں فاش کیا جبکہ سیاسی رہنماؤں کے لئے لب کشائی بھی مشکل تھی۔ انہوں نے انگریزوں کی عمل داری کی ان پالیسیوں کے خلاف لکھا جو عوام کے منافی تھیں۔ یہ مضامین طنز و مزاح کے پردے میں پیش کئے گئے تھے اس لئے قانون کی گرفت میں بھی نہیں آسکے اور استہزا کا پہلو بھی برقرار رہا۔ ان مضامین میں پہلی بار سیاست کو طنز و مزاح کا موضوع بنا کر پیش کیا گیا۔ منشی سجاد حسین کا مضمون "انڈے بچے والی چیل چلہاڑ" اس دور کا تخلیق کیا ہوا ہے جب انڈین نیشنل کانگریس میں زندگی کے آثار پائے جا رہے تھے۔ اور کانگریس کی مخالفت میں "انٹی کانگریس" کے نام سے ایک طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ لہٰذا سجاد حسین "انٹی کانگریس" کی مخالفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

> "بھلا یہ کیونکر ممکن ہے بی کانگریس صاحبہ لکھنؤ مرحوم میں جان تازہ پھونکنے چھپر کی رونق بڑھانے خراماں خراماں تشریف لائیں اور بی انٹی صاحبہ چپ شاہ کی بالکی نمو بی منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی رہیں۔ اجی توبہ کیجئے بولیں اور بیچ کھیت بولیں[1]"

سجاد حسین طنز و مزاح کے پیرائے میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار بھرپور انداز میں کر دیتے ہیں۔ سجاد حسین کے خطوط بھی سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ خطوط انہوں نے بحیثیت مدیر "اودھ پنچ" مختلف اوقات میں مختلف افسرانِ بالا کو تحریر کئے تھے، خط کا ایک حصہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے :-

> "صاحب من ! جب کسی قسم کی کارروائی کا مصمم ارادہ کر لیا جائے اور کچھ لحاظ نہ رہے کہ ملک کے مناسب حال ہے یا نہیں تو ظاہر ہے کہ موقع افہام و تفہیم، گنجائش، پند و وعظ اس طرح غائب ہے جیسے برہما یا ہندوستان مگر دنیا کا کوئی حل بے نتیجے رہ نہیں سکتا۔ آج نہیں کل، یہاں نہیں وہاں، ضرور بالضرور، کچھ نہ کچھ اثر ضرور کرتا ہے ممکن کیا یقین سہی کہ تم نے آہ و نالے کی طرف سے کانوں میں انگلیاں بڑے زور سے

---

[1] اودھ پنچ، جلد سوم شمارہ ۳۰، نومبر ۱۸۹۹ء ص ۸۔

ٹھونس لیں، حالتِ خستہ کی طرف سے آنکھ پھیر لی[1]۔"

منشی سجاد حسین اپنے خطوط میں طنز کا پہلو پیدا کر لیتے ہیں جو یقیناً طنز سے خالی نہیں ہوتا۔ انہوں نے جو خطوط انگریز افسروں کو لکھے ہیں، ان میں بھی تیر و نشتر سے کام لیکر اپنی بات کہی ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"لارڈ رنڈالف چرچل جو بد قسمتیٔ ہندوستان سے وزیرِ ہند ہوئے ہیں، بجائے خود تیز آدمی ہیں مگر کمسنی اور درشت گوئی اور بد زبانی مانعِ ترقی ہے۔ معاملاتِ ہندوستان تمہاری خاص توجہ کے محتاج ہیں اور میری رائے میں تم بھی اس کی یہ سمجھ لو کہ آزادگی اور شوریدگی قوم کی دست برد سے اعزازِ قیصری سے محفوظ رکھنے کا صندوقچہ ہندوستان ہی ہے[2]۔"

منشی سجاد حسین کے اس طرح کے متعدد خطوط ملتے ہیں جن میں طنز و مزاح کے پیرایۂ بیان میں حکامِ بالا کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا ہے یا پھر ان کے دانستہ طور پر اپنائے گئے بے جا رویّے کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی پنڈت جوالا پرشاد برقؔ ہیں۔ انہوں نے طنز و مزاح اور تحریف کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے جوالا پرشاد برقؔ کو اردو ادب کا ہوریس اور چاسر کہا ہے۔ پنڈت جوالا پرساد برقؔ کے بیشتر تراجم ملتے ہیں۔ انہوں نے چند ایسے مضامین بھی لکھے جن میں سیاسی اور ملکی مسائل پر سیر حاصل بحث مل جاتی ہے۔ ان کا ایک مضمون "البرٹ بل" بطور خاص قابلِ توجہ ہے۔ اس مضمون کا ایک فکاہیہ نمونہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

"..... اختیار ملا مگر برائے نام مگر ہمت نہ ہارنا چاہیئے۔ پارلیمنٹ میں واویلا ضرور ہو۔ ہندیو، دشمنوں سے سبق لو، کچھ کھو چکے اب تو سیکھو۔ دیکھو حقوق کے واسطے لڑنا جھگڑنا ہی کام آتا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اگر تم بھی گورنمنٹ ہوس پر چڑھ دوڑنے کی فکر کرتے، فتنہ انگیزی پر کمر باندھتے، تلواریں سنبھالتے تو کچھ مل ہی رہتا مگر شر ہمارا شیوہ نہیں ہم

---

[1] وزیر آغا "اردو ادب میں طنز و مزاح" ص ۲۲۶۔ [2] کشن پرشاد کول "اودھ پنچ کے نورتن" منقول ادبی اور قومی تذکرے ۱۹۵۵ء جلد دوم ص ۲۱۰۔

تو سچے خیر خواہِ سرکار ہیں۔ مگر ہائے رے سال بھر کی محنت کھاری کنویں میں ڈوب گئی، کیا کیا خیالی قلعے بنائے گئے مگر گنسکا ڈٹ کے ایک ہی گولے نے ان کا صفایا کر دیا۔[۱]"

طنز و مزاح نگاروں میں نواب سید محمود آزاد کا نام بڑی خصوصیت کا حامل ہے۔ وہ اپنے تلخ تجربات کو شوخی و ظرافت کے پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خطوط میں مغربی تہذیب اور ثقافت کا مضحکہ اڑایا ہے۔ انہوں نے تحریفات کے انداز میں ایک "ڈکشنری" بھی تحریر کی تھی جس میں انہوں نے ظریفانہ پیرائے میں بعض تلمیحات کے معنی بتائے ہیں۔ چند اقتباس ذیل میں نقل کئے جا رہے ہیں:-

"پولیسی (حکمت عملی)۔۔۔ ممبران پارلیمنٹ کے آپس کا ناز و نیاز کمزور کو دبانا زبردست سے ڈرنا۔۔۔ مار کے آگے بھاگتے کے پیچھے جانا۔ کسی کے جلتے ہوئے گھر سے تاپنا، پارٹی فیلنگ (پاسداری جماعت) مرغ بے ہنگام کی طرح چلّانا۔ غول بیابانی کا قائم مقام بن کر اپنے ہم قسموں کو راہ راست سے بہکانا۔ بے ہودہ شکایت، ناجائز تہمت، وزارت کے کھونے کا صدمہ، جگر گداز، کوئی سُنے نہ سُنے اپنی کہے جانا۔۔۔"

"پارلیمنٹ (جلسہ مدبران ملکی) مدبروں کا آشیانہ، کسی ملک کے قابل لوگوں کی قوت گویائی کا تماشہ دکھانے کا تھیٹر، باہمی نفاق اور ذاتی رشک وحسد کا تنور، انصاف آموزی کا وہ اسکول جہاں روسیوں کے ظلم ناحق کے انسداد کی کوئی عمدہ سبیل نہیں۔"

"یورپین کنسرٹ (یورپ کے سلاطین کا اتفاق) تمدن کی آراستہ فوج، دنیا کی آزادی کا ضامن، مشرقی مسئلوں کے حل کرنے کی کھرل، کمزور کو زور آور اور زور آور کو کمزور بنانے والی ولایتی کل، کمزور سلطنتوں کے لئے بٹوارے کا نیا قانون۔۔۔[۲]"

سید محمود آزاد کے مضامین میں "روداد اجلاس جنجال کونسل"، اور گرما گرم تار کی خبریں ہندوستان کے سیاسی مسائل پر لکھی گئی ہیں۔

---

[۱] کشن پرشاد کول "اودھ پنچ کے نورتن" منقول از ادبی اور قومی تذکرے" جلد دوم ۱۹۵۵ء ص ۲۳۰۔
[۲] نئی ڈکشنری "منقول از خیالات آزاد" مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ۱۹۶۶ء لاہور، ص ۱۶ - ۱۱۔

اس دور کے اخبارات میں "اپنچ" بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ اخبار پٹنہ سے جاری ہوا تھا۔ اس اخبار نے اس دور کے عصری سیاسی اور سماجی مسائل اور ہنگاموں سے بحث کی ہے۔ "اپنچ" میں "سوال از آسمان و جواب از ریسمان" کے عنوان کے تحت انگریزی تہذیب کی مخالفت، غلامی کا احساس اور ہندوستانیوں کی زبوں حالی کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ چند اقتباسات ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں:

سوال: ہندوستانی دن میں کتنی دفعہ کھاتے ہیں۔ اور انگریز دن میں کتنی دفعہ اور کون کون وقت کھاتے ہیں؟

جواب: امیر ہندوستانی دن میں ایک دفعہ کھاتے ہیں کیونکہ اس سے زیادہ بیچاروں کو میسر ہی نہیں۔ اور غریب بیچارے کبھی دو دن اور کبھی تین دن میں ایک مرتبہ کھاتے ہیں۔ انگریز دن میں پانچ مرتبہ ....

سوال: انگریزی کھانوں میں پڈنگ بنانے کا کیا طریقہ ہے؟

جواب: پڈنگ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان سے گیہوں روپے من کے حساب سے خرید کر انگلینڈ چلان ہوتا ہے وہاں اس کا مائدہ بنتا ہے اور وہاں سے روپے سیر کے حساب سے یہاں روانہ کیا جاتا ہے۔ اس مائدہ میں گھی، دودھ اور چینی ملا آگ پر چڑھا دیتے ہیں۔ جب تیار ہو جاتا ہے تو اس میں سور کی چربی بجائے گلاب اور کیوڑے کے ڈالتے ہیں ...."[1]

ایک اقتباس اور ملاحظہ کیجئے۔

سوال: خون کے مجرم کو قانون کی کس دفعہ کی رو سے سزا دی جائے گی؟

جواب: ہندوستانی کو سزا دینے کے لئے کسی دفعہ کی ضرورت نہیں، جب چاہے قید کیجئے اور جب چاہے پھانسی دیجئے۔ مگر کوئی انگلش نژاد وفادار رعیت دس ہندوستانی بھی مار ڈالے تو کچھ پروا نہیں۔

سوال: سزائے حبس دوام بعبور (کذا) دریائے شور کن مجرموں کے لئے مقرر کی گئی ہے؟

---

[1] عبدالرزاق قریشی "نوائے آزادی" ۱۹۵۷ء ص ۵۶ - ۵۵۔

جواب : پہلے تو یہ سزا صرف دو تین مجرموں کے لئے تھی مگر دو جرم اس میں اور بڑھائے گئے ہیں۔ ایک تو کسی انگریز سے مقابلے کے ساتھ باتیں کرنی، دوسرے گورنمنٹ کی کسی بات پر نکتہ چینی کرنی۔[1]

مذکورہ بالا سطور میں چند اقتباسات "اودھ پنچ" کے تحریر کئے گئے جو انگریزوں حاکموں کے سفاکانہ رویئے کے خلاف تھے۔

اودھ پنچ کے بعد طنز و مزاح کا عبوری دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے مزاح نگاروں میں مہدی افادی، محفوظ علی بدایونی، نیاز فتحپوری، سجاد یلدرم، سلطان حیدر جوش، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، سجاد انصاری، قاضی عبدالغفار، ملا رموزی، وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

معین عقیل عبوری دور کے قلم کاروں کے سیاسی رجحانات اور اصابت فکر کا جائزہ لیتے ہوئے اس طرح رقمطراز ہیں:۔

"محفوظ علی بدایونی، سلطان حیدر جوش، پریم چند، سجاد انصاری، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، ملا رموزی، ایسے صاحب قلم ہیں جنہوں نے اپنی ظریفانہ تحریروں کے ذریعے مغربی تہذیب، مغربی افکار، مغربی سیاسیات اور برطانوی حکومت کی مخالفت کی۔ ان کی تحریروں میں اپنے عہد کی سیاسی ہلچل اور مسائل کی عکاسی ہے۔ ان میں سے بعض نے اپنی تحریروں کا مقصد محض اپنی قوم کے کردار کی اصلاح تک ہی محدود رکھا۔"[2]

میر محفوظ علی نے سیاسی مباحث پر متعدد مضامین لکھے ان کے مضامین میں "انجمن تجاہل عامیانہ کا غیر معمولی جلسہ"، "کاروائی جلسہ"، حاجی صاحب کی تقریر اور کاروائی جلسہ"، "حاجی صاحب کی تقریر جنگ پر"، "بلبلانِ اسیر کی رہائی"، "مسٹر صاحب دین" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ میر محفوظ علی علی برادران کی جیل سے رہائی پر اپنے ایک مضمون "بلبلانِ اسیر کی رہائی" میں لکھتے ہیں:۔

بچہ: ابا جان یہ کیا کام کرتے ہیں؟

باپ: اس ملک کے ہندو مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں۔

---

[1] عبدالرزاق قریشی "نوائے آزادی" ص ۵۰۔ [2] معین عقیل "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" ص ۶۰۹۔

بچہ: تو کیا جسے ضرورت ہو سود اسلف لا دیتے ہیں ؟

باپ: ہماری محبت تو انہیں ایسی ہے کہ اس کے لیئے بھی تیار ہیں لیکن اصل میں یہ اور بڑے بڑے بھاری کام کرتے ہیں ۔

بچہ: تو کیا یہ بوجھ اُٹھاتے ہیں ؟

باپ: (آنکھوں میں آنسو آ گئے) حقیقت میں یہ بڑے بھاری بوجھ اُٹھاتے ہیں لے"

طنز و مزاح کی تاریخ میں مولانا ابو الکلام آزاد کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ وہ ایک صاحبِ طرز ادیب، سیاست دان، اعلیٰ پائے کے صحافی اور طنز و مزاح نگار تھے ۔ طنز و مزاح کے ضمن میں "الہلال" کا شذرہ "افکار و حوادث" قابلِ ذکر ہے اس میں مولانا کی طنزیہ و مزاحیہ تحریریں ہوتی تھیں ۔ جن میں کہیں کہیں انگریزوں کو ہدف طنز بنایا گیا ہے ۔

مولانا محمد علی جوہر کا نام ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے ۔ وہ محب وطن تھے ۔ انہوں نے لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنس میں انگریزوں سے کہا تھا "میں یہاں سے آزادی کا وثیقہ لیکر جاؤں گا یا پھر یہیں پر اپنی جان دے دوں گا ۔" بالآخر مولانا محمد علی جوہر کی وفات لندن میں ہوئی اور انہوں نے ملک کی آزادی کے لیئے اپنی جان قربان کر دی ۔

مولانا محمد علی جوہر نے اسی مقصد کے تحت اخبار "ہمدرد" جاری کیا ۔ یہ ایک اہم سیاسی اخبار تھا ۔ "ہمدرد" میں انہوں نے متعدد سیاسی مضامین لکھے اور ایسے وقت میں قلم اٹھایا جب ملک میں بہت سے سیاسی مسائل پیدا ہو چکے تھے ۔ سیاسی طور پر ہندوستان کے حالات منتشر تھے مولانا محمد علی جوہر نے اپنے قلم اور خیالات کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت انجام دی ۔ ان کا ایک مضمون "سائمن کمیشن اور ہندوستان" کے عنوان سے "ہمدرد" کے ۲۹ جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا ۔ اس مضمون میں لکھتے ہیں :-

"حسرت صاحب (مولانا حسرت موہانی) چاہتے ہیں کہ کمیشن کو ایک ڈاک خانہ بنایا جائے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ سے بنائے ہوئے دستور اساسی کے تیار ہونے تک جیسے حسرت صاحب اس کمیشن کے منھ

لے ابو اللیث صدیقی "آج کا اُردو ادب" ص ۲۷۳ ۔

پر پھینکنے کے لئے ہم سے کہتے ہیں ہم ایک پوسٹ کارڈ ڈاک خانے میں ڈال دیں، جس میں لکھا ہو کہ ہم تمہارا خیر مقدم نہیں کر سکتے، یہ پوسٹ کارڈ صرف ۳ر فروری کی ہڑتال ہو گی[1]"

اس مضمون میں انہوں نے ہندوستان میں کمیشن کی آمد کی کھل کر مخالفت کی تھی نیز حکومت پر طنز بھی کئے تھے۔ رقمطراز ہیں:۔

"اگر کمیشن کا ہر رکن ہندوستانی ہوتا تب بھی ہمیں کمیشن ہرگز قبول نہ ہوتا اس لئے کہ اگرچہ خوش دامن صاحبہ تشریف نہ رکھتیں تاہم آخر فیصلہ میاں بیوی کے ہاتھ میں نہ ہوتا بلکہ ہندو مسلمان دونوں بیویاں بن جاتے اور سوکنوں اور بیرنوں کی طرح لڑتے اور فیصلہ میاں کرتے اگر ہم دونوں اتحاد و اتفاق بھی کر لیتے تب بھی جب تک فیصلہ برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھ ہوتا۔ وہی عربوں کی مثل صادق آتی ہے کہ "ہر کام میں گھر والی سے مشورہ ضرور کر لیا کرو مگر کیا وہی کرو جو تم خود مناسب سمجھو[2]"

اس دور کے طنز و مزاح نگاروں میں ملا رموزی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ملا رموزی کی نثر بڑی متنوع ہے۔ انہوں نے سیاست، مذہب، تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت اور ادب و قومیت کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا۔ ان کے طنز و مزاح کا بیشتر حصہ سیاست پر مشتمل ہے۔ ان کے مضامین میں سیاسی واقعات اور سانحات کی طرف اشارے جگہ جگہ مل جاتے ہیں۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:۔

"اے انگریزی تیل سر میں ڈالنے والو! خبرداری اور آگاہی ہے واسطے تمہارے ان ایڈیٹروں اخبار اُردو کے کہ نہیں جواب دیتے وہ مبلغ ایک برس تک نامہ نگاروں اور خریداروں اپنے کو ساتھ بہانہ مصروفیتوں اپنی کے۔ اور لائڈ جارج وفد مسٹر محمد علی کو ساتھ تعصب اور گھمنڈ قوت حکومت اپنی کے اگرچہ دم بیچ ناک کے کر دیا جماعت سن فیل نے

---

[1] مولانا محمد علی جوہر "ہمدرد" بحوالہ افاداتِ محمد علی ۲۹ر جنوری ۱۹۲۸ء۔ [2] رئیس احمد جعفری "افادات محمد علی" ص ۱۳۳۔

فوجوں برطانیہ کا وغیرہ وغیرہ۔"[1]

طنز و مزاح کا عبوری دور ختم ہو جانے کے بعد جدید طنز و مزاح کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں رجحانات میں تبدیلیاں آئیں اور سیاسی صورت حال نے بھی نیا موڑ لیا۔ اس دور کے طنز و مزاح نگاروں میں فرحت اللہ بیگ، عظمت اللہ خاں، ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، امتیاز علی تاج، میاں عبدالعزیز فلک پیما، کنہیا لال کپور، احمد شاہ بخاری پطرس، عظیم بیگ چغتائی، کرشن چندر، شوکت تھانوی، حاجی لق لق، رشید احمد صدیقی وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں۔

ان مزاح نگاروں میں صرف انہیں کو زیرِ بحث لائے ہیں جن کے یہاں سیاسی اعتبار سے طنز و مزاح کے پہلو ملتے ہیں۔ اس ضمن میں عظمت اللہ خاں کی تحریروں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ عظمت اللہ خاں ایک سنجیدہ طنز و مزاح نگار ہیں۔ وہ بڑی عمدگی اور شگفتگی سے اپنی بات قاری تک پہنچاتے ہیں۔ ان کے مضامین بڑے دلچسپ اور سنجیدہ ہوتے ہیں جو قاری کی دلچسپی کو آخر تک برقرار رکھتے ہیں۔ عظمت اللہ خاں کی تحریروں کو پڑھتے وقت قاری کے مطالعہ میں ارتکاز پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے اس طرح کے مضامین میں "گڑیا خانہ"۔ "ڈیڑھ اینٹ" خاص طور پر سامنے آئے ہیں۔ ان مضامین میں اس دور کے سیاسی مسائل پر خاطر خواہ بحث مل جاتی ہے۔ مضمون "ڈیڑھ اینٹ" میں لکھتے ہیں۔

"غرض ہندوستانی افواج کا احسان کہ برطانیہ کو ہندوستان پر مسلط کر دیا، امن کا دور دورہ ہوا۔ لارڈ میکالے کا کرم کہ ایک طرف تعزیرات ہند مرتب کیا اور دوسری طرف علم مغرب کی گنگا بہائی۔"[2]

اس مضمون کا ایک اور اقتباس جس میں سنجیدگی کے ساتھ طنز کا پہلو ملتا ہے، ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:۔

"مشہور ہے کہ کسی انگریز سے پوچھا گیا کہ آپ کو ہندوستان کا کونسا میوہ بھایا؟ تو اس ستم ظریف نے ساری ہندوستانی ڈیڑھ اینٹ کی تحقیقات بھر دی۔ اس نے ہنس کر صرف یہ کہا "پھوٹ"۔"[3]

---

[1] بحوالہ وزیر آغا "اردو ادب میں طنز و مزاح" ۱۹۵۸ء ص ۱۸۷۔ [2] کلیم الدین احمد "اردو ادب میں طنز و ظرافت" منقول از نقوش لاہور طنز و مزاح نمبر ص ۱۶۶۔ [3] کلیم الدین احمد طنز و مزاح نمبر نقوش لاہور ص ۱۸۱۔

مضمون "گڑیا خانہ" میں لکھتے ہیں :۔

"اب وہی ہندوستان ہے جہاں مادرِ وطن اور سوراج کی خاطر مہاتما اور مولانا جیل جانا فخر سمجھتے ہیں اور جب وہاں سے نکلتے ہیں تو لوگ انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ محض وطن پرستی کی گڑیا کے اشارے پر اور جیل خانہ کیا ہے ؟ برطانوی شہنشاہیت اور دفتر شاہی گڑیوں کا ایک گورکھ دھندا ہے[1]۔"

میاں عبدالعزیز فلک پیما کا نام طنز و مزاح کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی نثر شگفتہ، لہجہ دل نشین متین اور سنجیدہ ہے۔ فلک پیما کے مضامین میں عصری سیاسی مسائل اور عوام کی جدوجہد آزادی سے بحث ملتی ہے۔ ان کے اس قسم کے مضامین میں "شملے کی سڑکیں"، "عدالتیں"، اور "شیطان اور بزرگ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مضمون "شملے کی سڑکیں" میں لکھتے ہیں :۔

"شملے کی سڑکیں لاکھ سرپٹخیں، حکومت کی مغرور ور رکشا کے لئے آٹھ نہیں آٹھ کروڑ ننگے پاؤں موجود ہیں[2]۔"

فلک پیما مختلف کرداروں کی زبان سے اپنی بات بڑی عمدگی کے ساتھ طنز کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ مضمون "عدالتیں" میں لکھتے ہیں :۔

"پنجاب میں چار قسم کی عدالتیں ہیں ان کے دروازوں پر دس بجے سے چار بجے تک متواتر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد مفصلہ ذیل قسم کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔

چلو پکوڑی چند اور قرض محمد

چلو کروڑی مل اور خاقے خاں

چلو لالہ گروی مل اور مرہون الٰہی

یہ چل چلاؤ غدر کے بعد شروع ہوا تھا اور شاید قیامت تک رہے[3]۔"

---

[1] کلیم الدین احمد "اردو ادب میں طنز و ظرافت" طنز و مزاح نمبر نقوش لاہور ص ۲۲۵۔ [2] عبدالعزیز فلک پیما مضامین فلک پیما" ص ۱۲۹۔ [3] عبدالعزیز فلک پیما "مضامین فلک پیما" ص ۱۰۸۔

مضمون "شیطان اور بزرگ" میں لکھتے ہیں :-

"..... جس مسلمان کو شیطان ملے وہ بجائے نعوذ باللہ کہنے کے خوش اخلاقی سے پیش آئے اسے موٹر میں سیر کرائے اور اگر موقع ملے تو کسی ہندو کانگریسی یا مہاسبھائی لیڈر سے شیطان کا تعارف کرائے، شیطان کے لئے بھی ایک نئی دلچسپی ہوگی"[1]

فلک پیما اپنے ایک مضمون میں "فرانس اور ہندوستان" میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"کوئی ہزار سال سے ہندوستان کا منصوبہ یہ ہے کہ غیر ملکوں سے لوگوں کو ورغلا کر یہاں لایا جائے۔ انہیں حکومت پسندی سکھا کر کمزور کیا جائے اور یہ چال کھیلی جائے کہ ساری دنیا میں کوئی اس ذلت سے نہ بچ سکے .... آج کل انگریز بیچارے تختۂ مشق ہیں ...... اصل منشا یہی ہے کہ جب باری باری "سب قومیں ہندوستان پر حکومت کر کے کمزور ہو جائیں تو پھر ہندوستان ایک دم ساری دنیا پر حاوی ہو کر شہنشاہی کرنے لگے"[2]

اقتباس بالا سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ فلک پیما نے اپنے مضامین میں انگریزوں کا تمسخر اڑایا ہے اور ان کی بد اعمالیوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

اُردو طنز و مزاح میں چراغ حسن حسرت موہانی کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ حسرت جنگ آزادی کے عظیم مجاہد تھے۔ انہوں نے بیشتر فکاہیہ کالم لکھے۔ اس دور کی سیاسی صورت حال، ہنگامی واقعات اور دیگر مسائل سے بحث کی ہے۔ پنجاب کی چند سیاسی شخصیتوں کو طنز کا نشانہ بنایا۔ اور چند انگریز پرست سیاست دانوں کا تمسخر اڑایا ہے۔ اپنی کتاب "پنجاب کا جغرافیہ" میں لکھتے ہیں :-

کانگریسی ندی نالے

بھارگو پربت اور ست پڑا سے بھی برسات کے موسم میں اکثر ندی نالے نکلتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی ندیوں میں نیشنل کانگریس ندی بہت مشہور

---

[1] عبدالعزیز فلک پیما "مضامین فلک پیما" ص ۲۶۱۔
[2] " " ص ۲۱۱

ہے جو ست پڑا ہے ایک زمانے میں بہہ نکلی تھی یہ گدلے پانی کی ایک لمبی ندی تھی جس میں بہت سی نالیوں اور موریوں کا بھی پانی آتا تھا۔ بہر حال یہ برساتی ندی تھی اور اب خشک پڑی ہے۔

دریائے کالی

ہندو مہا سبھا کی پہاڑیوں سے کچھ آگے ایک بہت بڑا چشمہ ہے جسے "کالی ناگ" کہتے ہیں۔ یہ دریا اسی چشمے سے نکلتا ہے اور ہندو مہا سبھا کی ترائی اور کانگریسی سلسلہ کوہستان سے مٹی اور سنگریزے بہا لاتا ہے..... کانگریسی سلسلہ کوہ اور ہندو مہا سبھا کی ترائی دونوں کے باشندے اس پر اپنا حق جتاتے ہیں مگر اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ دریا کس علاقے کے زیادہ رقبہ کو سیراب کرتا ہے۔ اس کا گیت دیسی ہے مگر گیت کی دھن بدیسی ہے اس کا طاس جسے ٹریبیوں کہتے ہیں "بہت زرخیز ہے"[1]

جہاں تک شوکت تھانوی کی مزاح کا تعلق ہے وہ بڑے زود نویس قسم کے مزاح نگار تھے۔ "سودیشی ریل" اور "لکھنؤ کانگریس سیشن" ان دونوں تحریروں میں انہوں نے اس دور کی سیاسی تحریکوں کو اجاگر کیا ہے۔ سودیشی ریل میں لکھتے ہیں:۔

"دیکھتے ہیں کیا کہ ایک بڑا جلوس جھنڈوں، جھنڈیوں اور گیسوں سے سجا ہوا، بندے ماترم کے نعروں سے آسمان اور زمین کو ٹکراتا ہوا ہمارے مکان کے سامنے سے گذر رہا ہے۔ ہم نے لوگوں سے پوچھا بھائی یہ کیا ہے؟

جواب ملا کہ کیا سو رہے تھے؟

خبر نہیں کہ سوراج مل گیا ہے۔"......

اور ایک آزاد اور خود مختار سانس لیکر ہم نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد سمجھا ہے....."[2]

---

[1] بحوالہ "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" ص ۶۱۹۔

[2] " " " " ص ۲۱ - ۶۲۰۔

"لکھنؤ کانگریس سیشن" کا اقتباس ملاحظہ ہو :-

"ایجنڈے میں اب آزادیِ کامل کی تجویز تھی امید تھی کہ اس پر زبردست مباحثہ ہوگا مگر ہوا یہ کہ یہ تجویز تو متفقہ طور پر منظور ہو گئی مگر سوال یہ تھا کہ آخر اس تجویز کو عملی صورت میں کونسی جماعت لائے۔

نواب زادگان نے شہزادوں کی طرف اشارہ کر کے کہا

حضرت پہلے آپ آزادی حاصل کریں۔

شہزادگان نے کہا۔ "نہیں پہلے آپ"

نواب زادگان نے کہا "پہلے آپ"

شہزادوں نے کہا۔ واللہ یہ نہ ہوگا۔

پہلے آپ، آخر اس پہلے آپ اور نہیں۔

حضرت اس پہلے آپ ہی میں صبح ہو گئی اور اجلاس ختم ہو گیا۔"[1]

کنہیا لال کپور نے معاشرے میں پھیلے ہوئے سیاسی انتشار، بدعنوانیوں اور بدانتظامیوں کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ سیاسی عمائدین اور زعماء کی شخصی کمزوریوں اور خامیوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں :-

"آپ نے سیاست کی باقاعدہ تعلیم کہاں حاصل کی ؟ اپنے آپ کو مہاتما گاندھی، مسٹر چرچل اور جوزف اسٹالین سے کیوں افضل سمجھتے ہیں ؟
آپ جیل خانے سے کیوں ڈرتے ہیں ؟"[2]

ایک اور جگہ گاندھی جی کی قربانیوں سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں :-

"کمال کر دکھایا مہاتما جی نے !
پورے تین ہفتہ کچھ نہیں کھایا
روحانی طاقت ہے۔
اوتار ہیں۔"

---

[1] بحوالہ "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" ص ۶۲۱۔ [2] کنہیا لال کپور "چنگ و رباب" ص ۴۴۔

میں نے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ مہاتماجی کبھی مر نہیں سکتے۔"

ایک دفعہ تو دنیا کو ہلا دیا

میں کہتا ہوں یہ ہے اصلی شجاعت

یہی تو میں کہتا ہوں کہ ہندوستان سے تمام بزدلوں کو چن چن کر مار دیا جائے تو ہندوستان آج آزاد ہو سکتا ہے۔

تمہارا کیا خیال ہے تمام بزدلوں کو گولی مار دی جائے

ہاں

تو پھر ہندوستان میں رہ ہی کون جائے گا۔"[1]

رشید احمد صدیقی کا نام اردو دنیا میں بحیثیت طنز و مزاح نگار بڑی امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے یہاں طنز و ظرافت کے پس پشت چند اصلاحی مقاصد بھی نظر آتے ہیں جو تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے بڑے اہم اور ضروری تصور کئے جاتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ ذکاوت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ معمولی بات کو اپنی تحریروں کا موضوع بنا کر طنز کا پہلو مقصدیت کے تحت پیدا کر لیتے ہیں۔ ان تحریروں کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے۔

"عشاق اور انگریز دو قومیں ایسی ہیں جو نہ تعزیرات ہند سے ڈرتی ہیں اور نہ میونسپلٹی سے۔ انگریز تو ممکن ہے اس لیے نہ ڈرتے ہوں کہ تعزیراتِ ہند اور میونسپلٹی دونوں ان کی آوردہ ہیں۔ عشاق یوں نہیں ڈرتے کہ رزق اور موت دونوں سے بے نیاز ہیں۔"

"انگریزوں کو آئی سی ایس نے خراب کیا۔ عشاق کو شعراء نے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کو شعراء اور آئی سی ایس کے اثر سے آزاد کر دیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ سوراج مل جائے۔ انگریزوں میں عشاق اور عشاق میں انگریز بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔"[2]

ہر ہندوستانی کے دو پیدائشی حق ہیں۔ ایک بلوغ اور دوسرا سوراج۔"[3]

---

[1] کنہیالال کپور "شیشہ و تیشہ" ص ۲۲-۲۳۔ [2] رشید احمد صدیقی "مضامین رشید" ص ۲۵۳
[3] ایضاً ص ۲۴۹

نان کو آپریشن کے مانند مغالطہ بھی ایک کیفیت دماغی ہے اور ممکن ہے
یہی سبب ہو کہ کو آپریشن اور مغالطہ اب تک کسی منطقی یا نفسیاتی تعریف
کے متحمل نہ ہو سکے ۔"

اُردو نثر میں طنز و مزاح، تحریف اور فکاہیہ مضامین کا جو سلسلہ غالب کے خطوط سے شروع ہوا تھا "اودھ پنچ" کے لکھنے والوں نے اسے باضابطہ فن کی حیثیت دی۔ اخبار "البنچ" نے اس کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔ کنہیا لال کپور اور رشید احمد صدیقی جیسے صاحب قلم فنکاروں نے اسے نقطۂ عروج تک پہنچایا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اُردو طنز و مزاح نگاروں نے اپنی گرانقدر تحریروں کے ذریعہ عوام کو غلامی کا احساس دلایا اور آزادیٔ ہند کی تحریکوں کے فروغ میں بھرپور حصّہ لیا۔

تحریکِ آزادی
اور
اردو خود نوشت و سوانح

ایک فرد اپنی زندگی کا طویل سفر کرنے کے بعد جب عمر طبعی کو پہنچتا ہے تو اسے اپنی گذشتہ زندگی کے حالات وکوائف، جن سے وہ دوچار ہے، ضبطِ تحریر میں لانے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح گذشتہ زندگی کے طویل عرصہ پر محیط جب فرد اپنی زندگی کے مکمل طور پر قلم بند کر لیتا ہے تو اس تحریر کو ہم خود نوشت سوانح عمری کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

خود نوشت سوانح عمریاں مختلف پہلوؤں اور مختلف جہتوں سے ہمارے سامنے آئی ہیں۔ مثلاً سیاسی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی وغیرہ۔ خود نوشت میں چونکہ فرد اپنی زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ اپنے مشاہدات و تجربات اور رجحانات و میلانات اور ماحول وغیرہ کا ذکر کرتا ہے اس لئے وہ دراصل تاریخ ہوتی ہے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور پورے معاشرے کی۔ خود نوشت زیادہ اہم ہوتی ہے بہ نسبت سوانح عمری کے۔ کیونکہ خود نوشت کو فرد خود قلم بند کرتا ہے، جب کہ سوانح عمری میں ایسا نہیں ہوتا۔

اُردو ادب میں سیاسی، و سماجی خود نوشت سوانح عمری کے نمونے انیسویں صدی کے ربع آخر میں مل جاتے ہیں۔ سیاسی خود نوشت سے مراد ان خود نوشت سوانح عمریوں سے ہے جنہیں یا تو کسی سیاسی یا سماجی شخصیت نے قلم بند کیا ہو یا ان میں سیاسی و سماجی مسائل زیرِ بحث آئے ہوں۔ سیاسی خود نوشت سوانح نگار اپنے مقصد سے شدید ذہنی و جذباتی لگاؤ رکھتا ہے اور ہر چند اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے نیز اپنے نظریات کی تبلیغ کرتا ہے۔ اس لئے یہ ذہنی و جذباتی

وابستگی اور تبلیغ اس کو جانبداری میں مبتلا کر دیتی ہے جس کے سبب وہ ہر واقعہ کو اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے مصنف کے حالاتِ زندگی تو صرف ایک زیب داستان کے طور پر بیان ہوتے ہیں۔ اصل میں اس کی خود نوشت کا نقطۂ نگاہ کوئی تحریک یا سیاسی نظریات ہوتے ہیں۔ جنہیں وہ عوام تک پہنچاتا ہے۔ سیاسی و سماجی خود نوشت سوانح عمریوں میں تاریخی عناصر کی فراوانی ہوتی ہے کیونکہ خود نوشت کا مصنف براہِ راست یا بلاواسطہ طور پر کسی تحریک یا کسی سیاسی تنظیم سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے بیانات سیاسی ہوتے ہوئے بھی کافی وقیع ہوتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سیاسی و سماجی خود نوشت سوانح عمریوں میں ایک ہی تحریک یا واقعہ مختلف اور متضاد شکل میں نظر آتا ہے۔ اس کا سبب یہ بھی ہے کہ مختلف اشخاص ایک ہی واقعہ کو اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں یا واقعات کے کسی خاص پہلو کو اجاگر کرنے میں اپنی توجہ صرف کر دیتے ہیں۔ اس طرح سیاسی یا سماجی خود نوشتیں تاریخی عنصر کی فراوانی کے باوجود تاریخ کا نعم البدل نہیں ہیں۔ البتہ تاریخ کے لئے مواد ضرور فراہم کرتی ہیں۔ سیاسی و سماجی خود نوشت سوانح عمریاں بیشتر خارجی واقعات اور حادثات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان میں جذبات کی عکاسی بہت کم ہوتی ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جس کی بدولت سیاسی و سماجی خود نوشت کا کینوس بیشتر سیاسی تحریکات اشخاص و افکار پر مبنی ہوتا ہے۔

اس باب میں شامل خود نوشت سوانح عمریوں کے نام اس طرح ہیں۔ "تواریخ عجیب موسوم بہ کالاپانی" از جعفر تھانیسری۔ "داستانِ غدر" از ظہیر دہلوی۔ "اعمال نامہ" از رضا علی۔ "میرا افسانہ" از چودھری افضل حق۔ "یادِ ایام" از نواب احمد سعید خاں چھتاری، "سرگزشت" از عبد المجید سالک بٹالوی، "لطیف کی کہانی" از عبد اللطیف بٹالوی۔ "تلاشِ حق" از مہاتما گاندھی مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین۔ "اپنی کہانی" از ڈاکٹر راجندر پرشاد مترجمہ گوپی ناتھ امن۔ "نقشِ حیات" از مولانا حسین احمد مدنی۔ "میری کہانی" از جواہر لال نہرو۔

مذکورہ بالا خود نوشت سوانح عمریوں کو سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جعفر تھانیسری نے اپنے ایامِ اسیری کے زمانے میں "تواریخ عجیب موسوم بہ کالاپانی" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اس خود نوشت میں انہوں نے وہابی تحریک کا تذکرہ کیا ہے اور اس تحریک

کے سرگرم کارکنوں کا بھی بطور خاص ذکر کیا ہے نیز انگریزوں کے مظالم کی روداد بھی بیان کی ہے۔ اس میں آزادی کی جدوجہد اور احیائے دین بیک وقت دونوں سے بحث مل جاتی ہے۔ جعفر تھانیسری "تواریخ عجیب" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک مجھے علم ہے اس مقدمہ (انبالہ) میں ہم لوگوں کی گرفتاری بھی منشائے ایزدی اور اس آیت کی فقط سچ اور جھوٹ کی پرکھ اور آزمائش کے واسطے تھی ورنہ وعدہ حق موجود ہے" وَلَن يَجْعَلَ اللهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا "پس اگر یہ سبب آزمائش کا نہ ہوتا تو کبھی بھی سرکار انگریزی کے ہاتھوں ہمیں صدمہ نہ پہنچتا......

پس یہ کتاب گویا آیت مذکورہ بالا کی تفسیر سمجھنی چاہیے"[1]

جعفر تھانیسری نے اس خودنوشت میں اپنے انبالہ کے مقدمہ اور قید فرنگ کے بیس سال کے حالات و کوائف کو قلم بند کیا ہے۔ نیز اپنی زندگی کے مذہبی اور سیاسی حالات کو بھی مفصل طور پر بیان کیا ہے۔ ہندوستانیوں پر انگریزوں کے مظالم اور خصوصاً وہابیوں کی تحاریک کی مقبولیت محنت کش اور زبوں حال عوام کی داستان تحریر کی گئی ہے۔

ایک اہم خودنوشت سوانح عمری " داستانِ غدر" ہے۔ اس کو اردو کی اولین خودنوشت تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے مصنف ظہیر دہلوی تھے۔ ظہیر دہلوی کی وابستگی بہادر شاہ ظفر کے دربار سے رہی۔ اسی لئے یہ کتاب اس دور کی سیاسی کشمکش، امرا و سلاطین کی سراسیمگی کی آنکھوں دیکھی تصویر پیش کرتی ہے۔

ظہیر دہلوی نے اپنی اس کتاب میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے ذکر کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے حالات، تہذیبی اور ثقافتی منظر میں بیان کئے ہیں۔ اس خودنوشت میں انقلاب ۱۸۵۷ء زیادہ نمایاں ہے اور ان کی زندگی کے حالات پس پشت نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ "میر امن سے عبدالحق تک میں" رقمطراز ہیں:۔

" داستانِ وقائع غدر میں آپ بیتی کا حصہ حقیقت نگاری کے لحاظ سے جیسا کچھ بھی ہو اس میں مجلسی روابط اور سماجی احوال کی بڑی معلومات افزا اور

---

[1] جعفر تھانیسری "تواریخ عجیب" اسلامی پریس لاہور ۱۳۰۹ھ ص ۵۔

سبق آموز داستان ملتی ہے خصوصاً دہلی اور قلعۂ معلّٰی کی معاشرت کے دلچسپ نقشے نظر سے گذرتے ہیں۔[۱]"

غدر ۱۸۵۷ء میں جو حالات وقوع پذیر ہوئے ظہیر دہلوی نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور بعینہٖ ان واقعات کا حال بڑی دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ سپرد قلم کیا ہے۔ اس قیامت صغریٰ سے ان کے خاندان کے افراد بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ ان کے خسر اور چچا انگریزوں کے مظالم کا شکار ہوئے اور انھیں بھی جلا وطنی کی سزا دی گئی۔ وہ دربدری اور خانہ بدوشی کی داستان قلعۂ معلّٰی کی رسمی رونق سے شروع کرکے انگریزوں کے مظالم اور یوریپوں کے مظالم پر ختم کر دیتے ہیں۔ ظہیر دہلوی نے انگریزوں کے مظالم کی ہولناک داستان بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب مولا بخش ہاتھی کو سانڈرس کے سامنے پیش کیا گیا تو اسے یہ ہاتھی بھی باغی نظر آیا۔ ہاتھی کا باغی ہونا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہر آزادی پسند اور حریت پسند انسان انگریزوں کو باغی نظر آتا تھا بلکہ غلامی کے اثرات جانوروں نے بھی قبول کئے تھے۔

ظہیر دہلوی نے اپنی کتاب میں بہادر شاہ ظفر کو اس انقلاب سے بے تعلق ظاہر کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ جب بادشاہ کے پاس میرٹھ کے باغی فوجی کمک کے لئے پہنچے تو انہوں نے کہا:-

"سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے، میں فقیر ہوں ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لئے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی ہے..... میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں میرے پاس خزانہ نہیں کہ تم کو تنخواہ دوں گا۔ فوج نہیں کہ تمہاری مدد کروں گا۔ ایک امر میرے اختیار میں ہے البتہ وہ ممکن ہے کہ میں تمہارے درمیان ہو کر انگریزوں سے صلح صفائی کرا سکتا ہوں۔[۲]"

بہر حال "داستان غدر" کی قدر و قیمت اور تاریخی اہمیت سے اردو کا کوئی بھی ذی شعور ادیب انکار نہیں کر سکتا۔ یہ اردو کی ابتدائی خود نوشتوں میں سے ہے جو اپنے اسلوب بیان اور تاریخی و سیاسی واقعات کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

۱؎ سید عبد اللہ "میر امن سے عبد الحق تک" ۱۹۶۵ء ص ۸۳۔

۲؎ ظہیر دہلوی "داستانِ غدر" ص ۴۴۔

اس سلسلے کی ایک اور اہم خودنوشت "اعمال نامہ" ہے۔ اس خودنوشت کو سر رضا علی نے تصنیف کیا تھا جس کو اُردو کی ایک مکمل اور مستند خودنوشت کہا جا سکتا ہے۔ "اعمال نامہ" کا مطالعہ کرنے کے بعد اس عہد کی سیاسی تنظیموں اور خصوصاً مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیاں اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ "اعمال نامہ" میں پیش کردہ سیاسی حالات اور ادبی مباحث پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کو سیاست سے جس قدر لگاؤ تھا اسی قدر وہ ادب کا بھی دلدادہ تھا۔ سیاسی بصیرت اور ادبی ذوق کا حسن امتزاج "اعمال نامہ" کو دوسری خودنوشتوں سے ممیز اور ممتاز بنا دیتا ہے۔ اس دور میں مسلمانوں کی ایک اہم جماعت "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" تھی۔ اس کانفرنس میں سر رضا علی نے سیاسی سطح پر بڑی اہم خدمات انجام دیں۔ اس کانفرنس کا ایک اجلاس بنگال میں ہونا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہار اور بنگال کے مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ ۱۹۰۶ء میں جب مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو انہوں نے یہ احساس ہوا کہ اس کے پس پردہ کہیں حکومت اور لیفٹیننٹ گورنر کا ہاتھ تو نہیں ہے اور اس انجمن کے ذریعے مسلمانوں کو قعر گمراہی میں تو نہیں ڈالنا چاہتے۔ لیگ پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:-

> "حقیقت یہ ہے کہ لیگ قائم کرنے سے بانیان لیگ کی غرض گورنمنٹ کو امداد دینا یا کانفرنس کی مخالفت کرنا نہیں تھی بلکہ اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کی جن کو ایک طرف گورنمنٹ اور دوسری طرف کانگریس پامال کر رہی تھی کماحقہٗ مخالفت کی جائے۔"[1]

سر رضا علی نے ۱۹۱۱ء کی ہندو مسلم کانفرنس کا تذکرہ کیا ہے جس میں اُردو ہندی، انتخاب کے مسائل زیر غور آئے تھے۔ اس کتاب میں مچھلی شہر کانپور کا مسئلہ اور اس کے سیاسی نیز مذہبی پہلوؤں پر بھی تبصرہ ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے سفاکانہ مظالم کا بیان مفصل طور پر کیا گیا ہے۔ سر رضا علی کی خودنوشت گذشتہ پچاس سالہ ہندوستانی معاشرت اور سیاست پر محیط ہے۔

"میرا افسانہ" چودھری افضل حق کی تصنیف کردہ خودنوشت ہے۔ اس کا زیادہ حصّہ سیاسی ہے

---

[1] سر رضا علی "اعمال نامہ" ص ۱۱۱۔

لیکن اس میں کہیں کہیں مذہبی رنگ بھی ملتا ہے۔ مصنف کی پوری توجہ ملک کے سیاسی اور قومی کردار پر مرتکز نظر آتی ہے۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں بہت ہنگامہ خیز تصور کی جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں چودھری افضل حق کا تقرر سب انسپکٹر پولس کی حیثیت سے لدھیانہ میں ہوا تو انہیں ہنگامہ خیز حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ انہوں نے اس دور کے مختلف حالات کو اپنی کتاب میں قلم بند کیا ہے۔ پولس افسران کے ناروا مظالم اور معاندانہ رویوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک پولس انسپکٹر کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"غلام ہندوستان میں سب انسپکٹر پولس کا بھوکا بھیڑیا ہے۔ جدھر منہ اٹھایا لوگوں کو چیرتا پھاڑتا چلا جاتا ہے۔ سرکار کے ملازمین کے ہاتھوں انسانیت کی ایسی تذلیل شاید ہی کہیں ہوتی ہو[1]۔"

ان کی خودنوشت کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور انگریزوں کے ظلم و استبداد کا پتہ چلتا ہے۔ چودھری افضل حق محب وطن تھے۔ ان کے دل میں محبت کا جذبہ کارفرما تھا۔ ملک و قوم کی خدمت کی غرض سے انہوں نے اپنی نوکری سے استعفٰی دیدیا اور آزادی کے لئے جدوجہد کرنا شروع کر دی۔ گاؤں گاؤں جاکر تقریریں کیں۔ عوام کو غلامی سے نجات دلانے اور انگریز عملداری کے خلاف اکسانے میں اہم رول ادا کیا۔ نتیجہ کے طور پر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ طرح طرح سے ایذا پہنچائی گئی جس کا بیان مندرجہ ذیل الفاظ میں اس طرح کیا گیا ہے:۔

"غرض بابر کا ہندوستان دلچسپی سے خالی ہو رہا تھا اور قید خانوں کی کشش بڑھ رہی تھی۔ دو برس کی مسلسل دعوت اسیری و خواہش پابندی کے باوجود میں ابھی آزاد تھا اس لئے دل مغموم اور ناشاد تھا۔ اپنی شکستہ پائی پر افسوس اور ہم سفروں کے منزل مقصود تک رسائی پر رشک آتا تھا۔ دل دردمند کی زاری پرواز پیدا کیا اور یک بیک در اجابت کھلا[2]۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس وقت چودھری صاحب گرفتار ہوئے اسوقت تک ہندوستان کے بیشتر حریت پسند جیلوں کو اپنا مسکن بنا چکے تھے۔ مصنف کی

---

[1] چودھری افضل حق "میرا افسانہ" ص ۴۷۔
[2] ص ۲۸۔

گرفتاری، جیل کے تلخ تجربات، انگریز حاکموں کا ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک وہاں کی مقید اور پابند زندگی کی تصویر، انگریز نما ہندوستانیوں کے سفاکانہ رویئے اس خودنوشت کے نصف سے زیادہ حصّے پر چھائے ہوئے ہیں۔ بلکہ اس کتاب کا اختتام بھی جیل ہی کے ایک عجیب واقعہ کے عنوان کے تحت ہوتا ہے۔ جس جیل میں چودھری صاحب کو رکھا گیا تھا اتفاق سے اسی جیل میں سردار بھگت سنگھ بھی تھے۔ بھگت سنگھ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ میری تقریر و ترغیب کی بنا پر تحریکِ آزادی میں شریک ہوئے تھے۔ ان کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جیل میں سیاسی قیدیوں کے دو گروہ تھے۔ ایک گاندھی جی کے "اہنسا" پر گامزن تھا اور دوسرا حسرت موہانی کا ماننے والا۔

چودھری افضل کی خودنوشت "اعمال نامہ" سیاسی ہونے کے باوجود زبان و اسلوب کے اعتبار سے ادبیت کی حامل ہے۔ اسی کے ساتھ اپنے عہد کے سیاسی حالات اور حریت پسندوں کے جذبات کی مؤثر عکاسی کرتی ہے۔

نواب احمد سعید خاں چھتاری نے "یادِ ایام" کے عنوان سے اپنی خودنوشت تحریر کی تھی۔ "یادِ ایام" سیاسی خودنوشتوں میں ایک مخصوص اہمیت کی حامل ہے۔ یہ نواب صاحب کی شخصیت اور ہندوستان کی آزادی اور وطن کے دیگر مسائل پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں انہوں نے انگریز حاکموں کی رعونت اور انسان ناشناسی کے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے دوسرے حصّے میں دونوں گول میز کانفرنسوں کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے، جو اس دور کی سیاست پر روشنی ڈالتا ہے۔

نواب چھتاری کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اشخاص جنہوں نے ۱۸۵۷ کے حادثات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا انہوں نے ہندوستان چھوڑنے کا قصد کر لیا کیونکہ انگریز افسروں کا رویّہ ہندوستانیوں کے ساتھ بہت اہانت آمیز تھا۔ نواب چھتاری کلکٹر سے ملاقات کے آداب کا حال تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

" اس زمانے میں ملاقاتیوں کو خواہ کوئی ہو ٹاؤن ہال میں بٹھایا جاتا تھا۔ ٹاؤن کا ہال کا فاصلہ کلکٹر صاحب کی کوٹھی سے کم از کم ساٹھ گز ہوگا اور چپراسی کوٹھی کے برآمدے سے کھڑا ہلا کر ملاقاتی کو آواز دیتا اور یہ صاحب

کوہ ندا کی آواز پر افتاں وخیزاں چل پڑتے ہیں۔[۱]"

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انگریزوں کا رویہ ہندوستان کے عوام کے ساتھ کتنا تحقیر آمیز تھا۔ نواب صاحب نے صوبہ کی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصّہ لیا تھا۔ وہ انگریزوں کی حکومت میں مختلف منصبوں پر بھی فائز رہے تھے۔ انہوں نے مختلف تحریکوں مثلاً گول میز کانفرنس، تحریک عدم تعاون اور انگریزوں کی ملکی پالیسی وغیرہ کو بڑے معروضی انداز میں بیان کیا ہے۔ تحریک ترک موالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"اس تحریک نے ہندوستانیوں میں سیاسی شعور پیدا کیا جس کا اس سے پہلے سوائے چند حضرات کے فقدان تھا۔ اس سیاسی شعور سے ہندوستانیوں میں خود آرائی آئی۔ اس تحریک نے انگریزوں کے دماغ سے دعوئ خدائی کو بڑی حد تک دور کر دیا اور ان کے مزاج میں اس تحریک نے اعتدال پیدا کیا، ہندوستانیوں کو اپنے ملک کی چیزوں کی طرف مائل کیا۔[۲]"

"سرگذشت" عبدالمجید سالک بٹالوی کی خود نوشت ہے۔ اس سرگذشت میں سیاسی اور ادبی ہندوستان بری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے۔ سالک نے اپنی خود نوشت میں سیاسی معلومات فراہم کی ہیں۔ اور اس عہد کے تمام واقعات اور حادثات کو پوری طرح شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ گاندھی اور رولٹ ایکٹ ۳۰ رمارچ ۱۹۱۹ء کی ملک ہڑتال، جلیانوالہ باغ کا حادثہ، مسلم لیگ، خلافت کانفرنس، تحریک عدم تعاون، مولانا محمد علی کا وفد یورپ کے لئے۔ مالویہ جی اور شردھانند کی تحریک، سنگھٹن اور شدھی، امرتسر میں تنظیم کانفرنس جس کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے منعقد کیا تھا۔ بندے ماترم پرتاپ اور ملاپ کا اجراء، نہرو رپورٹ اور اس کا ردِ عمل، اخبار انقلاب اور زمیندار کے مضامین، غرض کہ اس دور کی پوری ملکی اور ملی تاریخ ان کے فکر وفن کا محور تھی۔ اس طرح سالک کی سرگذشت اپنے دور کے سیاسی حالات اور تحریکوں کا آئینہ دار ہے۔ سالک نے اپنی سرگذشت میں اپنے دور کی اہم شخصیتوں کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ ان میں قادر گرامی، محمد اقبال، گاندھی جی، محمد علی جناح، جواہر لال، رابندر

---

[۱] نواب چھتاری "یادِ ایام" ص ۴۰۔
[۲] " " " ص ۶۶-۶۷۔

ناتھ ٹیگور، مسز اینی بیسنٹ، خواجہ حسن نظامی، بیدل شاہجہاں پوری، محمد دین تاثیر وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ سیاسی اور صحافتی تاریخ کے طور پر بھی سالک کی سرگذشت بہت اہم ہے۔

عبداللطیف بٹالوی نے اپنی سیاسی زندگی کی داستان "لطیف کہانی" کے نام سے قلم بند کی۔ عبداللطیف بٹالوی کا نام ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں خصوصیت کا حامل ہے۔ اپنی خودنوشت میں عبداللطیف نے اہم سیاسی شخصیتوں مثلاً ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، مولانا شوکت علی وغیرہ کے اعمال و افعال کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لطیف کی کہانی اس دور کی سیاسی تاریخ کی دستاویز ہے۔ اس خودنوشت میں انہوں نے ۱۹۱۹ء کی ہڑتال، شدھی اور نہرو رپورٹ، کانپور انکوائری کمیٹی رپورٹ، ۱۹۳۶ء کا الیکشن، زمینداروں کی حالت، یوپی کی تقسیم کا مسئلہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں نہرو، انصاری، سندر لال شوکت علی، اور پنڈت گوبند بلبھ پنت وغیرہ کے خطوط کو بھی درج کیا ہے۔ جس سے ان حضرات کی سیاسی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ عبداللطیف بٹالوی نے سیاست کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اس خودنوشت میں ان کی پوری تفصیل ملتی ہے۔ انہوں نے ۱۹۶۰ء میں پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"میں تمام سیاسی جماعتوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اس وقت ملک خطرے میں ہے چائنا سر پر بیٹھا ہے معلوم نہیں کل کو کیا حشر ہوگا۔ میں ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کمیونسٹوں کیخلاف ایک متحدہ محاذ بنائیں اور اپنے اختلافات کو فی الحال بھول جائیں[1]"

ڈاکٹر راجندر پرساد نے "اپنی کہانی" کے نام سے خودنوشت لکھی تھی۔ اس خودنوشت کا ترجمہ گوپی ناتھ امن نے کیا تھا اور ساہتیہ اکادمی دہلی نے پہلی بار مئی ۱۹۶۱ء میں اس کتاب کو شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرساد خود ایک بڑے سیاست داں تھے۔ انہوں نے آزادی کی تحریکوں میں گاندھی جی، پنڈت نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے سیاسی قائدین کے ساتھ رہ کر کام کیا تھا، اور ان تمام تجربات اور تحریکوں کا ذکر انہوں نے "اپنی کہانی" میں کیا ہے۔ اس وقت ہندوستان کے مختلف حصّوں میں ستیہ گرہ کی تحریک جاری تھی۔ بار دولی میں زمین کا لگان بڑھانے

---

[1] عبداللطیف بٹالوی "لطیف کی کہانی" ص ۲۱۳۔

کی وجہ سے ستیہ گرہ ہوا۔ باردولی ستیہ گرہ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"باردولی ستیہ گرہ خوب کامیاب رہا، حکومت نے اپنی طرف سے ہر طرح اسے دبانے کی کوشش کی۔ لوگوں نے بھی جوش کے ساتھ اس جبر و تشدد کو برداشت کیا۔ سختیاں جھیلنے میں عوام کو پوری طرح کامیابی ملی، گاندھی جی کی دعا اور امداد تو شاملِ حال تھی ہی تحریک چلانے کا سارا بھار حقیقتاً سردار ولبھ بھائی پٹیل پر تھا۔ جنہوں نے اسے بڑی عقلمندی، استقلال، بے خوفی اور محنت سے چلایا تھا۔ سبھی پارٹیوں کے لوگوں نے انتہائی اہم تحریک سمجھا، سب نے مدد بھی دی [1]"

اس کتاب میں راجندر پرساد نے پہلی جنگ عظیم۔ رولٹ ایکٹ۔ کے خلاف تحریک، پنجاب میں ترکِ موالات، موپلہ بغاوت، ستیہ گرہ کی تیاری، چوراچوری کا سانحہ، سوراج پارٹی کا جنم، ہندو مسلم مسئلے، سائمن کمیشن کی آمد، گاندھی جی کی ڈانڈی یاترا، نمک ستیہ گرہ، مسلم لیگ کا قیام وغیرہ کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ راجندر پرساد کی خود نوشت کا مطالعہ کرنے کے بعد سیاسی تحریکات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ راجندر پرساد کا تعلق گاندھی جی سے رہا ہے انہوں نے سیاسی تحریکوں میں گاندھی جی کا ساتھ دیا ہے۔ گاندھی جی سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میں وکالت تو زوروں سے کرتا رہا۔ مگر اب گاندھی جی سے بھی تعلق چھپنے والا نہیں تھا۔ رولٹ رپورٹ کے شائع ہونے کے بعد ملک میں ایک بڑی تحریک جاری ہو گئی۔ گاندھی جی نے اس کی رہنمائی اپنے ہاتھوں میں لی۔ بہار سے واپسی کے بعد گاندھی جی نے رہنمائی کر کے کھیڑا کے کسانوں کا جن پر مال گذاری کا اضافہ تھا۔ اضافہ چھڑا دیا۔ اور ستیہ گرہ کا اہتمام کرنا پڑا تھا۔ جب گاندھی جی سنہ ۱۹۱ء میں کھیڑا کا دورہ کر رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ گجرات کے کسانوں کے اس ضلع میں دو تین دن تک گھومتا پھرا تھا [2]"

ڈاکٹر راجندر پرساد موپلہ بغاوت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] راجندر پرشاد "اپنی کہانی" ص ۵۱۸۔
[2] ص ۲۰۷-۲۰۶۔

"گاندھی جی کلکتہ سے مدراس کی طرف چلے گئے۔ اس دورے میں کہیں انہوں نے لنگوٹی پہننے کا اعلان کر دیا۔ مولانا محمد علی جو دورے میں ساتھ والٹیر اسٹیشن پر گرفتار کر لئے گئے۔ وہ دوسرے کئی لیڈروں کے ساتھ جن میں مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا نثار احمد، پیر غلام مجدد، شری بھارتی کرشن اور تیرتھ شنکر اچاریہ بھی تھے۔ کراچی میں خلافت کانگریس کی تقریر اور فتوے کی تبلیغ کے لئے عدالت میں پیش کئے۔ اس مقدمے نے بھی ملک میں بڑی کھلبلی پیدا کر دی۔ مولانا محمد علی نے صفائی میں جو بیان دیا اس کی وجہ سے اور ان صاحبان کے بیان کے سبب سے جو اس میں ملزم تھے، یہ ایک بڑا اہم قدم ہو گیا۔ آخر شری شنکر اچاریہ کو چھوڑ کر سب کو سزائیں ہوئیں[1]"

راجندر پرساد کی خود نوشت "اپنی کہانی" اس عہد کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات و کوائف کی آئینہ دار ہے۔

گاندھی جی نے اپنی خود نوشت انگریزی میں لکھی تھی جس کا ترجمہ "تلاشِ حق" کے عنوان سے ڈاکٹر سیّد عابد حسین نے کیا تھا۔

گاندھی جی نے اپنی خود نوشت میں سیاسی رہنماؤں کی مختلف سیاسی تحریکوں میں شمولیت کا تذکرہ کیا ہے۔ ستیہ گرہ تحریک کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"ستیہ گرہ کی تحریک پہلے شروع ہوئی اور یہ نام بعد میں رکھا گیا۔ جب یہ اصول دریافت ہوا تو مجھے اس کے لئے کوئی نام نہیں ملتا تھا! ہم لوگ گجراتی میں بھی اس کے لئے انگریزی لفظ PASSIVE RESISTANCE (مقاومت مجہول) استعمال کرتے تھے۔ جب مجھے یورپیوں کے ایک جلسے میں یہ معلوم ہوا کہ PASSIVE RESISTANCE کے معنی بہت محدود ہیں۔ یہ کمزوروں کی تلوار سمجھی جاتی ہے۔ اس میں نفرت کا مفہوم بھی آ سکتا ہے اور تشدد کی شکل میں ظاہر ہو سکتی ہے تو مجھے یہ ظاہر کرنے کی ضرورت

---

[1] راجندر پرشاد "اپنی کہانی" ص ۲۷۵۔

پڑی کہ ہندوستانی تحریک ان چیزوں سے بڑی ہے۔ اور اس کی ماہیت بالکل دوسری ہے۔ ہمیں یہ محسوس ہوا کہ اس جدوجہد کا صحیح مفہوم ادا کرنے کے لئے کوئی نیا لفظ تلاش کرنا ضروری ہے۔ میں نے لاکھ کوشش کی مگر مجھے کوئی نیا نام نہیں سوجھا۔ اس لئے میں نے "انڈین اوپنین" میں اعلان کیا کہ اس کے پڑھنے والوں میں جو شخص سب سے اچھا نام تجویز کرے گا اسے ایک چھوٹا سا انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ مگن لال گاندھی نے "ست آگرہ" (ست یعنی حق، آگرہ۔ ثبات) کا لفظ وضع کیا مگر میں نے سہولت کے خیال سے بدل کر "ستیاگرہ" کر دیا۔ اس وقت سے گجراتی میں اس تحریک کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے[1]۔"

گاندھی جی کی تحریکوں کے سلسلے میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:۔

"۱۹۰۸ء میں جب میں نے "ہند و سوراج میں کھدر کو ہندوستان کے روز افزوں افلاس کا علاج قرار دیا، اس وقت تک مجھے کبھی چرخہ یا کرگھا دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کتاب میں میں نے یہ بات ایک بدیہی اصول کے طور پر پیش کی کہ جو چیز ہندوستان کو افلاس کی چکی میں پسنے سے بچائے اس نے گویا سوراج قائم کر دیا۔ ہندوستان کا افلاس دور ہوتے ہی سوراج خود بخود مل جائے گا[2]۔"

گاندھی جی "ترکِ موالات" کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"مولانا شوکت علی کی فرمائش سے میں نے ریل میں ترکِ موالات کا رزولیشن کا مسودہ مرتب کیا۔ اب تک میں نے اپنے مسودے میں NON - VIOLENT کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس موضوع سے متعلق ابھی میرے الفاظ کا ذخیرہ مکمل نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے مجمع میں NON VIOLENT کا مترادف سنسکرت لفظ استعمال کرتا ہوں تو لوگ

---

[1] گاندھی جی۔ "ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین" "تلاش حق"۔ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۸۶ء ص ۲۶۶،۲۶۷۔

[2] " " " " " " " " " " " " " ص ۴۸۳،۴۸۴۔

میرا مطلب پوری طرح نہیں سمجھتے۔ اس لئے مولانا ابوالکلام آزاد سے کہا کہ اس کے لئے کوئی اردو کا لفظ بتائیے۔ انہوں نے اس کا ترجمہ "بالامان" اور نان کوآپریشن کا "ترکِ موالات" تجویز کیا۔[1]"

گاندھی جی "تحریکِ ترکِ موالات" کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں:۔

"میں نے اپنے ریزولیوشن میں ترکِ موالات کا مقصد صرف یہ قرار دیا تھا کہ حکومت کو خلافت اور پنجاب کے معاملے میں انصاف کرنے پر مجبور کیا جائے یہ بات وجیا راگھوچارجی کو پسند نہیں آئی۔ انہوں نے کہا۔
"اگر ترکِ موالات کرنا ہی ہے تو کسی ضمنی بے انصافی کو دور کرنے کے لئے کیوں کی جائے۔ ملک پر سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ وہ سوراج سے محروم ہے۔ اسی کی چارہ جوئی کے لئے ترکِ موالات کرنا چاہیئے پنڈت نہرو بھی یہی چاہتے تھے کہ ریزرولیوشن میں سوراج کے مطالبہ کا اضافہ کر دیا جائے۔ میں نے یہ تجویز خوشی سے قبول کر لی اور اپنے ریزرولیوشن میں سوراج کا مطالبہ بھی شامل کر لیا۔[2]"

مولانا ابوالکلام آزاد نے INDIA WINS FREEDOM کے عنوان سے دو حصوں پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کتاب کے ایک حصے کا اُردو ترجمہ پروفیسر محمد مجیب نے "ہماری آزادی" کے نام سے کیا تھا۔ اس کتاب کا نصف سے زیادہ حصہ ان کی خودنوشت پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ باقی حصہ مولانا کی سیاسی تحریکوں سے وابستگی پر محیط ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی "میری کہانی" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے گول میز کانفرنس، گاندھی جی سے ملاقات، درجۂ نوآبادیات، کامل آزادی، انگریز حکومت کی کارگزاری کے علاوہ سیاسی تحریکوں اور ان تحریکوں میں اپنی شمولیت کا ذکر مفصل طور پر کیا ہے۔

پنڈت نہرو "میری کہانی" میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:۔

---

[1] گاندھی جی مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین "تلاش حق" ص ۶۹۵۔
[2] " " " " " " " " " " " ۶۹۶۔

"ہندوستان کا سیاسی اتحاد کو برطانوی ملوکیت کی ترقی کے لیے جو کوششیں کی گئیں اس کا پس منظر ایک ضمنی نتیجہ تھا۔ بعد کو جب یہ اتحاد جذبۂ قومیت کے ساتھ مل گیا اور غیروں کی حکومت کا مقابلہ کرنے کو کھڑا ہوا تو ہم نے دیکھا کہ انتشار اور فرقہ بندیوں کی، جو ہماری ترقی کے رستہ میں زبردست رکاوٹیں ہیں جان بوجھ کر پرورش کی گئی ہے[1]۔"

پنڈت نہرو برطانوی حکومت کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"برطانوی حکومت ہمارے ملک میں تفرقہ پیدا کرنے والے رجعت پسند، فرقہ پرست، اور مطلب پرست عناصر کی ہمت افزائی کرتی ہے مگر شاید یہ بھی ہمارے ملک کے لئے ایک ضروری آزمائش ہے اور ہندوستان کو نئی زندگی اسی وقت عطا ہوگی جب وہ بار بار اس آگ میں تپے، جو کھوٹ اور میل کو جلا دیتی ہے اور کچے لوہے کو فولاد بنا دیتی ہے[2]۔"

مولانا حسین احمد مدنی نے "نقشِ حیات" کے عنوان سے اپنی خود نوشت دو جلدوں میں مرتب کی تھی۔ "نقشِ حیات" کا ایک چوتھائی حصہ مولانا کے شب و روز کی زندگی، والدین، اعزہ اور لواحقین کے حالات پر مشتمل ہے۔ باقی صفحات میں ہندوستان میں انگریزوں کے مظالم اور استبداد کی داستان پیش کی گئی ہے مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں:۔

"۱۸۵۷ کے انقلاب میں ان کے اجداد بے یار و مددگار ہو گئے تھے۔"

"نقشِ حیات میں غدر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مجاہدین یا ان سے تعلق رکھنے والوں یا مشتبہ لوگوں پر مقدمات میں جس قدر مظالم ایذ ارسانی، توہین و تذلیل، مار پیٹ وغیرہ خلافِ انسانیت اور خلافِ تمدن کاروائیاں کی جاتی تھیں۔ ان کو سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ برطانیہ کی تاریخ ان وحشیانہ اعمال کی وجہ سے نہایت گندی اور سیاہ ہے۔ پولیٹیکل قیدیوں کے ساتھ جن امور کا تصور بھی متمدن حکومتوں میں ناجائز

---

[1] پنڈت جواہر لال نہرو "میری کہانی" جلد دوم اشاعت چہارم ص ۳۶۸۔

[2] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ص ۶۹۶۔

شمار کیا جاتا ہے ان پر عمل درآمد کرنے میں انگریز ان شریف النفس انسانوں کے لئے جھجک محسوس نہیں کرتے تھے اور ایسے ایسے ملعون اور منحوس معاملات ان شرفاء کے ساتھ عمل میں لایا کرتے تھے کہ بہترین اخلاقی قیدیوں کیساتھ بھی گوارا نہیں کئے جاتے تھے[۱]"

مولانا حسین احمد مدنی "نقشِ حیات" میں ایک اور مقام پر انگریزوں کی ذہنی پستی، اور اخلاقی گراوٹ کو اس طرح پیش کرتے ہیں:-

"انگریز ہندوستان میں آکر ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ جن جرائم کی اپنے ملک میں جرأت کر ہی نہیں سکتا ہندوستان میں ان کے ارتکاب کے واسطے انگریز کا نام جواز کا حکم رکھتا ہے اور اس کو سزا کا خیال تک نہیں ہو سکتا[۲]"

مولانا نے انگریزوں کے مظالم کے علاوہ، انگریزوں کی آمد سے لے کر ان کے انخلاء تک پوری تاریخ بیان کی ہے۔ اس میں انہوں نے دیوبند کے اکابرین کی آزادی کی تحریک میں شمولیت کا ذکر کیا ہے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مہاجر مکیؒ کی گرفتاری کے حالات مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی خود نوشت میں تحریر کئے ہیں۔

---

[۱] مولانا حسین احمد مدنی "نقشِ حیات" جلد دوم - ص ۳۶
[۲] 〃 〃 〃 〃 جلد اوّل - ص ۱۶۶

سوانح عمریاں لکھنے کا تصور سب سے پہلے یہودیوں کے یہاں ملتا ہے۔ یہودیوں نے ابتدا میں اپنے اسلاف اور قدما کے حالاتِ زندگی جمع کئے اس کے بعد آہستہ آہستہ اہلِ روما میں بھی یہ صنف رواج پانے لگی۔ اس طرح دن بدن سوانح عمریاں لکھنے کا رواج عام ہوتا گیا۔ جدید تحقیق کے مطابق سب سے پہلی سوانح عمری جو دوسری صدی عیسوی میں لکھی گئی "پلوٹارک" کی ہے۔ اس سوانح عمری کو بظاہر اعلیٰ اور وقیع قرار دیا گیا ہے۔

الطاف فاطمہ "فنِ سوانح نگاری کا ارتقاء" میں سوانح نگاری کے سلسلے میں لکھتی ہیں:-

"سوانح نگاری کسی فردِ واحد کی شخصیت کو منظرِ عام پر اس طرح لانے کا نام ہے کہ اس کی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہے۔ اس میں لکھنے والا اپنے ذاتی جذبات کو شامل کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ ہیرو کے محاسن اور معائب کو پیش کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے[1]"

کامیاب سوانح نگار کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ جس شخصیت پر قلم اٹھا رہا ہے اس کی زندگی کا کوئی بھی اہم گوشہ ضبط تحریر میں لانے سے نہ رہ جائے اور وہ معروضی ہو کر اس کی شخصیت اور سیرت کا بھرپور جائزہ لے۔

---

[1] الطاف فاطمہ "فن سوانح نگاری کا ارتقاء" ۱۹۷۰ء۔ ص ۱۸۔

الطاف فاطمہ نے ایک اور مقام پر فن سوانح نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"فن کار کے لئے اس کے فن پارے کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے لئے ایک ذریعۂ نجات بن جاتا ہے۔ دلوں برسوں کے ڈھکے چھپے خیالات اور جذبات اور جو فنکار کی روح و ذہن میں موجزن ہوتے ہیں نکاس کا راستہ پالیتے ہیں۔ اور اس طرح وہ ایک ایسے بارِ عظیم سے سبکدوش ہوجاتا ہے جو اس کے قلب و ذہن کو کچلتا ہوتا ہے۔"[1]

اردو فن سوانح نگاری کی ابتداء سر سیّد احمد خان کے رفقاء کی رہین منت ہے۔ سر سید احمد خان نے علی گڈھ تحریک کے زیرِ اثر رفقاء کا ایک ایسا حلقہ تیار کیا تھا جنہوں نے اپنے میدانوں میں قلم کے جوہر دکھائے۔ اس دور میں جہاں ادب کی دیگر اصناف کو فروغ حاصل ہوا وہاں فن سوانح نگاری پر بھی توجہ صرف کی گئی۔

سر سید کے رفقاء میں مولانا شبلی نے خصوصیت سے تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کو اپنا میدان بنایا۔ حالی نے تنقید نگاری اور شاعری کے علاوہ سوانح عمریاں بھی تصنیف کیں۔ انہوں نے یادگار غالب، حیات سعدی، اور حیات جاوید تصنیف کی۔ شبلی کے اسلاف کے عظیم کارناموں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، اور ان کے حالات قلم بند کئے۔

سوانح نگاری میں دار المصنفین کا سوانحی سلسلہ بھی بڑی اہمیت اور قدر و منزلت کا حامل ہے۔ اس سلسلے میں مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبد السلام ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مرزا حیرت دہلوی اور عبد الرزاق کانپوری کے یہاں بھی حالی اور شبلی کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر معین عقیل مذکورہ بالا سوانح نگاروں کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

"ان سوانح نگاروں کا ایک خاص رجحان یہ ہے کہ ان کے پیش نظر سوانح عمری محض مقصود بالذات نہیں۔ سوانح نگاروں کا مقصد کچھ اور ہے۔ سوانح عمری کو اس مقصد کے لئے ذریعہ اور وسیلہ بنایا گیا ہے۔ ان سب کی نظر میں اشخاص بڑے اشخاص کی حیثیت سے کم پڑتی ہے۔ ان کے دماغی کارناموں

---

[1] الطاف فاطمہ "فن سوانح نگاری کا ارتقاء" ۱۹۷۳ء ص ۲۲۔

کے اس حصے پر زیادہ پڑتی ہے۔ جس سے احیائے قومی کے لئے مواد حاصل کیا جاسکتا ہے[1]۔"

اس باب میں ہم نے ان سوانح عمریوں کو شامل کیا ہے جو یا تو سیاسی شخصیتوں پر لکھی گئیں یا پھر جن شخصیتوں کا تعلق ملک کی آزادی سے رہا۔

"وقار حیات" محمد اکرام اللہ خاں ندوی نے مرتب کی تھی جو ۱۹۲۸ء میں منظرِ عام پر آئی۔

قائد اعظم محمد علی جناح پر متعدد کتابیں لکھی گئیں ان کتابوں میں سے زیادہ تر سوانح عمریاں ہیں جو فنی اور سیاسی اعتبار سے کامیاب اور بھرپور نظر آتی ہیں۔ "حیات محمد علی جناح" رئیس احمد جعفری نے لکھی تھی جو ۱۹۴۲ء میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ اسی طرح ایک سوانح عمری خالد اختر افغانی نے "حالات قائد اعظم" کے عنوان سے تحریر کی تھی یہ کتاب بھی بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ "ایشیا کی سب سے بڑی شخصیت "محمد علی جناح" کے نام سے محمد عبد اللہ منہاس نے ایک سوانح تصنیف کی جو امرتسر سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں قائد اعظم کی شخصیت کو سیاسی اور قومی رہنما کی حیثیت سے نمایاں کیا گیا ہے اس طرح کی کتابیں سوانح عمریوں کی شکل میں کثرت سے لکھی گئیں۔

مولانا ابو الکلام آزاد کا نام جنگِ آزادیِ ہند کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک کثیر الجہات اور مجمع الصفات شخصیت کے مالک تھے۔ ابو الکلام آزاد پر بھی کثرت کے ساتھ کتابیں اور سوانح عمریاں تصنیف کی گئیں۔ ان کتابوں میں مولانا کے سیاسی افکار اور نظریات کو بالخصوص بیان کیا گیا ہے۔ ان میں مولانا شائق احمد عثمانی کی کتاب "امام الاحرار مولانا ابو الکلام آزاد" ہے جو ۱۹۴۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔

معین عقیل مذکورہ کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اس کتاب کے ابتدائی صفحات "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" مرتبہ عبد الرزاق ملیح آبادی کے خلاصے پر مشتمل ہے۔ ملیح آبادی کی مرتبہ کتاب میں اس کے بعد ۱۹۲۳ء کے حالات ہیں۔ اس کتاب میں مولانا کی علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی اور صحافتی زندگی، علم و فضل اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے[2]۔"

---

[1] معین عقیل "تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ" ص ۴۴۲۔
[2] " " " " " ص ۴۴۵۔

عبداللہ بٹ نے "ابوالکلام آزاد" کے نام سے اُردو میں دو کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب لاہور سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مولانا آزاد کی حیات، تصنیفات اور ان کے سیاسی کارناموں پر مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دوسری کتاب جو مولانا آزاد پر مختلف افراد کے لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے لاہور سے ۱۹۴۳ء میں طبع ہوئی تھی۔ "ابوالکلام آزاد" کے نام سے روشن نے مولانا آزاد کے خاندانی حالات، سوانح حیات، علمی، مذہبی اور سیاسی خدمات کے تعارف پر مبنی کتاب تحریر کی۔ یہ لاہور سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کے مفصل حالات الہلال کے مفید مضامین، مختصر مقدمہ کراچی اور خطبۂ صدارت شامل ہیں۔ منشی عبدالرحمٰن شیدا نے "سوانح ابوالکلام آزاد" تصنیف کی۔ یہ دہلی سے ۱۹۴۰ء میں طبع ہوئی۔ اس میں مولانا آزاد کے ابتدائی حالات سے ۱۹۴۰ء تک کے حالات علمی، مذہبی، سیاسی خدمات کے تعارف پر مشتمل ہے۔ آصف علی نے "سوانح ابوالکلام آزاد" تحریر کی۔ یہ بھی مولانا آزاد کے علمی، مذہبی، سیاسی خدمات کے تعارف پر مشتمل ہے۔ آخر میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ۵۳ ویں اجلاس منعقدہ رام گڑھ کا خطبۂ صدارت بھی شامل ہے۔ یہ کتاب دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ ابوسعید بزمی نے "مولانا ابوالکلام" تحریر کی۔ یہ لاہور سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مولانا آزاد کی علمی، مذہبی، سیاسی شخصیت کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

علامہ اقبال پر بھی متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ علامہ اقبال شاعر، فلسفی، اور مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست داں بھی تھے۔ انہیں اپنے ملک سے بے پایاں محبت اور لگاؤ تھا۔ محمد دین تاثیر نے "اقبال پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک ایک کتاب لکھی تھی، جو ۱۹۲۶ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ عنایت اللہ نے "حیات اقبال" لکھی جو ۱۹۳۸ء میں طبع ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی اقبال پر متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ ان کتابوں میں اقبال کے سیاسی اور ادبی کارناموں کا تذکرہ بالخصوص ملتا ہے۔

سوانح عمریوں کے علاوہ چند ایسی کتابیں بھی ضبط تحریر میں آئیں جن میں علماء اور قائدین کے تذکرے لکھے گئے ان کو مجموعی سوانح کے ضمن میں تحریر کیا جاسکتا ہے۔

مولانا محمد میاں کی کتاب "علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" خاص طور پر قابل

ذکر ہیں۔ اس کتاب میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے واقعات اور قائدین کی سیاسی ومذہبی فکروشعور کا ذکر ملتا ہے۔ ان علمار میں مولانا محمود الحسن، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ کے سیاسی نظریات سامنے آتے ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی پر محمد سرور کی ایک کتاب ملتی ہے جس کا سن اشاعت ۱۹۴۳ء درج ہے۔ اس کتاب میں عبیداللہ سندھی کا سیاسی نظریہ اور ان کی تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مہادیو ڈیسائی نے "خدائی خدمت گار" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا اردو ترجمہ محمود علی خان نے کیا تھا۔ یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب میں صوبہ سرحد اور وہاں کے باشندوں کی زندگی کے اہم واقعات سیاسی اور مذہبی خیالات کو مکالموں کی شکل میں تحریر کیا ہے۔

محمد عنایت اللہ نے "تذکرہ فرنگی محل" لکھی تھی۔ جو لکھنؤ سے ۱۹۳۰ء شائع ہوئی۔ اس میں قدمار اور دورِ حاضر کے علمار کا تذکرہ کیا گیا ہے اور فرنگی محل سے تعلق رکھنے والے وہ علمار بھی شامل تھے، جو اس دور کے سیاسی تحریکوں میں انگریزوں کے خلاف حصّہ لے رہے تھے۔

سیاسی رہنماؤں، مبلغین، قائدین پر سوانحی کتب کا سلسلہ بھی اس ضمن میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس طرح کی کتب میں مہری کی کتاب "ہندوستانی لیڈر" ہے۔ اس کتاب میں کانگریس اور مسلم لیگ سے متعلق سیاسی رہنماؤں کا مختصراً تذکرہ کیا گیا۔ یہ کتاب لاہور سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ جگدیش سنگھ نے "محبانِ وطن" تحریر کی تھی۔ اس میں ہندوستانی رہنماؤں کا ذکر کیا گیا ہے، یہ کتاب بھی لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ بادشاہ حسین نے "مشاہیرِ ہند" دو جلدوں میں تحریر کی تھی، جو ۱۹۳۷ء حیدرآباد دکن سے طبع ہوئی تھی۔ اس میں مختلف نظریات و مذاہب کے حامل قومی وسیاسی اکابرین کا ذکر کیا گیا ہے۔ "باغی لیڈر" کے نام سے قوم پرست قائدین کے حالاتِ زندگی مختلف اکابرین نے تحریر کئے تھے۔ اس کتاب کے مرتبین میں آچاریہ کرپلانی، کے۔ ایم منشی، اور یوسف میر علی شامل تھے۔ اس میں اس دور کے اہم اور نامور قوم پرستوں کے مختصر حالات تحریر کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی لاہور ہی سے شائع ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ مالویہ جی، لالہ لاجپت رائے، سروجنی نائیڈو، ٹیگور، سریندر ناتھ بنرجی، گوکھلے ڈاکٹر ذاکر حسین، مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں وغیرہ سیاسی رہنماؤں پر متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں جو سوانح عمریوں کی شکل میں ہمارے سامنے آئیں۔ ان کتابوں میں سیاسی رہنماؤں کے کارناموں نیز مسلم قوم کے تئیں ان کی سیاسی خدمات کا ذکر ملتا ہے۔

تحریک آزادی

اور

اردو صحافت

افراد سے اقوام کی تشکیل ہوتی ہے، فرد اور قوم دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں کیونکہ فرد کے بغیر قوم کا تصور ممکن نہیں۔ کسی قوم کے شعور کی بیداری میں اس عہد کے ماحول اور ادب دونوں کا بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ جب ہم ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں اس عہد کے پُر آشوب حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اخبارات نے ہندوستانی عوام و خواص کو ایک پلیٹ پر لانے اور ملکی شعور کو ایک خاص تحریک کی جانب راجح کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

عتیق صدیقی ہندوستانی اخباروں کا جائزہ لیتے ہوئے نٹ راجن کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> "انیسویں صدی کی چھٹی دہائی ہندوستان کی برطانوی تاریخ کا ایک اہم ترین زمانہ ہے۔ برطانوی ملک گیری کا جو سلسلہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں شروع ہوا تھا۔ پورے سو سال بعد یعنی ۱۸۵۶ء میں اودھ کے خاتمے پر اس کی تکمیل ہو گئی۔ اس موقع پر ہندوستانیوں نے ایک عظیم بغاوت کی شکل میں پلاسی کے قومی سانحے کی صد سالہ برسی کی۔ اس بغاوت کو جسے انگریزوں نے غدر کا مہمل نام دیا تھا بروئے کار لانے میں ہندوستانی اخباروں نے نمایاں حصّہ لیا۔"[1]

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو صحافت کا ایک خاص دور شروع ہوتا ہے۔ خورشید عبد السلام کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ:۔

---

(1) NATRAJAN : HISTORY OF INDIAN JOURNALISM - P.183
بحوالہ "ہندوستانی اخبار نویسی" از عتیق احمد صدیقی (۱۹۵۷ء) ص ۳۵۹

"ابتداء میں اردو اخباروں کا لب ولہجہ نرم اور مصلحت وقت کے تابع تھا اور زیادہ تر اخبارات کی توجہ سیاست کی جگہ مغربی علوم وفنون کی اشاعت پر مرتکز تھی، ملکی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر تاج برطانیہ کے زیرِ نگیں آگئی تو حکمراں طبقے کے طرزِ عمل میں کچھ بہتری کے آثار نظر آنے لگے اور اخبارات بھی ملکی مسائل پر دبی ہوئی زبان میں رائے زنی کرنے لگے۔"[۱]

انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد انگریزوں کے مسلسل سفاکانہ رویے سے ہندوستانی عوام اور سپاہ متنفر ہو چکی تھی اور انہوں نے انگریزی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ ۳۱ مئی اس کی تاریخ طے پائی تھی لیکن میرٹھ کے حریت پسندوں سے صبر نہ ہوسکا۔ ۱۰ مئی کو منگل پانڈے نے ایک انگریز افسر پر گولی چلادی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبل از وقت جنگ چھڑ گئی۔ اردو اخبار پہلے ہی اس تحریک کو پیش کر کے عوام میں بیداری کی لہر پیدا کر چکے تھے۔ اور ان کے دلوں میں آزادی کا جوش و ولولہ پیدا ہوگیا تھا۔

ملک گیر سطح پر وقوع پذیر ہونے والی اس تحریک کے دوران لارڈ کیننگ ہندوستان کا گورنر جنرل تھا۔ کیننگ ہندوستانی اخباروں کا مزاج سمجھ چکا تھا اس نے اس سلسلے میں کہا تھا:۔

"دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ یہ کام بڑی مستعدی چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا۔"[۲]

اس باب میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے ان اخبارات کو اور رسائل کو شامل کیا گیا ہے جو خالص سیاسی تھے اور جنہوں نے قومی شعور کو بیدار کرنے اور جنگِ آزادی کے لئے زمین ہموار کرنے میں اہم اور مؤثر کردار ادا کیا۔ اس دور کے اخبارات میں مولانا محمد باقر کا "دلی اردو اخبار ۱۸۳۶ء"، "سحر سامری" ۱۸۵۶ء، منشی نول کشور کا اردو اخبار ۱۸۵۹ء، مکند لال کا "تاریخ بغاوت آگرہ ۱۸۵۹ء"، عبد الرحمٰن کاشف کا اخبار "صبح" ۱۸۵۹ء، نصیر الدین آفندی کا "شمس الاخبار" مدراس ۱۸۵۹ء، اجودھیا پرساد کا "خیر خواہ خلق" اجمیر ۱۸۶۰ء، حیدر علی کا "شعلہ طور" کانپور ۱۸۶۰ء، محمد منظور کا "منظور الاخبار"

---

[۱] خورشید عبد السلام "صحافت پاکستان و ہند میں" ۱۹۶۳ء ص ۸۰۔ [۲] عتیق صدیقی "ہندوستانی اخبار نویسی" ص ۳۵۹۔

آگرہ ۱۸۶۰ء، میر فتح اللہ کا "کوہ گزٹ" ۱۸۶۰ء، آمراؤ علی کا ہفتہ وار" اخبار عالمتاب" آگرہ ۱۸۶۱ء، منشی امان علی کا ہفتہ وار" کشف الاخبار" بمبئی ۱۸۶۱ء، منشی عبدالحکیم کا" اخبار عالم" میرٹھ ۱۸۶۱ء، منشی دھر کا" آب حیات" ۱۸۶۳ء، محمد اکبر کا" عمدۃ الاخبار" ۱۸۶۳ء، اسماعیل خاں کا" لارنس گزٹ" میرٹھ ۱۸۶۰ء، محمد قاسم کا" قاسم الاخبار" بنگلور ۱۸۶۵ء، جمیل الدین کا" صادق الاخبار"، دبدبہ سکندری ۱۸۶۶ء وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

متذکرہ بالا اخباروں کا طرزِ تحریر، زبان و بیان لب ولہجہ براہ راست اور بالواسطہ طور پر انگریزوں کے خلاف ہی نہیں بلکہ تلخ بھی ہوتا تھا۔ اردو اخباروں نے قومی شعور کو بیدار کرنے، عوام کے دلوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے اور ان کے ارادوں کو مستحکم بنانے میں اہم اور موثر رول ادا کیا۔ ۱۸۵۷ کی قیامت صغریٰ کے فرو ہونے کے بعد مدیروں پر مظالم توڑے گئے۔ انہیں پھانسیاں دی گئیں۔ ان کے مطابع ضبط کر لئے گئے لیکن انہوں نے ہنستے ہوئے ان تمام مظالم کو برداشت کیا اور ملک کے لئے جان کی بازی لگا دی۔

"دلی اردو اخبار" ۱۸۵۷ء میں بند ہو گیا۔ اس اخبار کو مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر نکالتے تھے۔ یہ اس دور کا مقبول اخبار تھا۔ لیکن یہ انگریزوں کے عتاب سے نہ بچ سکا۔ امداد صابری "روحِ صحافت" میں لکھتے ہیں:۔

> "دہلی میں جب تک جنگِ آزادی جاری رہی اس وقت تک "دہلی اُردو اخبار" نے نہ صرف اپنے صفحات آزادی کو کامیاب کرنے کے لئے وقف کر رکھے تھے بلکہ اس کے بانی مولانا محمد باقر نے قلم کی جنگ کے علاوہ تلوار سے بھی انگریزوں سے جنگ لڑی اور جس وقت جنگ ناکام ہوئی اور انگریز دہلی پر قابض ہو گئے تو اخبار بند ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا محمد باقر انگریزوں کی گولی کا نشانہ بنے اور جامِ شہادت نوش کیا۔"[1]

"دہلی اردو اخبار کا نام آخری دنوں میں بہادر شاہ ظفر نے اپنے نام کی مناسبت سے "اخبار الظفر" تجویز کیا تھا۔ اس نام سے "دلی اُردو اخبار" کے صرف

---

[1] امداد صابری "روحِ صحافت" (۱۹۶۸) ص ۶۱-۲۶۰۔

دس شمارے دستیاب ہو سکے ہیں۔[1]"

آخری شمارے میں یہ خبر قابلِ ذکر ہے۔

"..... چاروں سے خوب لڑائی، توپ وتفنگ کی ہو رہی ہے۔ کفار نے نئے مورچے بنا لیے ادھر سے بھی مورچے جدید بنے ..... مجملاً اتنا بس ہے کہ انشاء اللہ صبح وشام تائیدِ ایزدِ قہار، قدرتِ قادر ذوالجلال سے فتح اسلام وہلاکت کفار نمایاں ہوتی ہے۔[2]"

اس دور کے اخباروں میں "اودھ اخبار" بھی ایک اہم اخبار تھا۔ یہ اخبار منشی نول کشور کی ادارت میں لکھنؤ میں معرضِ وجود میں آیا۔ یہ ہفتہ وار اخبار اپنے عہد کی ادبی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ کی مستند اور باوقار دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اپنے عہد کے حاکموں پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ لیکن اپنی متانت کو برقرار رکھتے ہوئے۔ اودھ اخبار نے ہندوستانیوں کے دلوں میں قومی بیداری پیدا کی جس کا ثبوت اس کے مختلف شماروں میں مل جاتا ہے۔

اودھ اخبار کے بارے میں گارساں دتاسی نے ۱۸۶۶ء میں لکھا تھا:۔

"یہ اخبار پچھلے سات سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ اس کی ہر اشاعت پچھلی اشاعتوں سے بہتر نظر آتی ہے۔ اسکی تقطیع اور صفحات کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ یہ اخبار ہفتہ وار ہے اور چہار شنبہ کو شائع ہوتا ہے۔ شروع شروع میں اس میں صرف چار صفحے شائع ہوا کرتے تھے اور وہ بھی چھوٹی تقطیع پر چھپے ہوئے اور پھر سولہ اور اب اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے کے مقابلے میں اس کی تقطیع بڑی ہوگئی ہے، میرے خیال میں اس سے زیادہ ضخیم اخبار ہندوستان بھر میں اور کوئی نہیں۔[3]"

اودھ اخبار حکومت کی بداعمالیوں اور اس کی حکمتِ عملی پر تنقید کرتا تھا۔ اس میں جاں نثارانِ وطن کی قربانیوں کی داستانیں بھی پیش کی جاتی تھیں۔ اس کے لکھنے والوں میں اردو کے معروف ادیب اور شاعر اور انشاء پرداز مثلاً رتن ناتھ سرشار، سید احمد اشہری اور مرزا حیرت دہلوی، مولانا

---

[1] عتیق احمد صدیقی "ہندوستانی اخبار نویسی" ص ۹۶-۲۹۵ [2] "اخبار الظفر" ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء

[3] خطبات گارساں دتاسی ص ۵۱۲۔

جالب دہلوی، احمد حسن شوکت اور غلام محمد خاں وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ قومی شعور کی بیداری میں اودھ اخبار کی پُرجوش اور ولولہ انگیز تحریروں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔

عوام کے دلوں میں آزادی کا جذبہ بیدار کرنے میں چربی والے کارتوسوں کا سانحہ بھی بڑا اہم ہے۔ "صادق الاخبار" کے ایک شمارے میں اس واقعہ سے متعلق خبر درج ذیل الفاظ میں دی گئی ہے۔

"ان دنوں تمام سپاہ سرکار نے نئے نئے کارتوسوں سے سرتابی کرنا شروع کر دی ہے۔ چنانچہ چند روز ہوئے کہ علاقہ بنگال میں کچھ پلٹنیں پھر گئی تھیں، ایک ان میں سے موقوف ہوئی اور اس کے افسروں کو بھی پھانسی کا حکم ہوا تھا۔۔۔۔ پلٹنیں گورکھا نمبر ۱۶ مقیم انبالہ نے بروقت قواعد عمل درآمد سے انکار کر دیا۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ از روئے ایک چٹھی سیالکوٹ کے ظاہر ہوا کہ یہاں کے سپاہی بھی نئے کارتوسوں کی قواعد سے مکرتے ہیں اور بجائے دانتوں کے ہاتھوں سے کارتوس توڑتے ہیں لوگوں کے دل کا شک بالکل رفع نہیں ہوا[1]"

عتیق احمد صدیقی "صادق الاخبار" کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:۔

"دہلی کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر اخبار "صادق الاخبار" تھا۔ جس نے بغاوت کے جذبات کی تخم ریزی میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا اور جس نے بغاوت کے دوران میں باغیوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی تھی[2]"

"صادق الاخبار" جنگِ آزادی میں پیش پیش رہا۔ اس نے اپنی وقیع تحریروں کے ذریعے ہندوستانیوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی۔ یہ اخبار عوام و خواص میں ازحد مقبول تھا۔

اس زمانے کے اردو اخباروں کے مختلف شماروں میں غدر کے حالات میری نظروں سے گذرے ہیں۔ یہ اخبارات نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، خدا بخش لائبریری پٹنہ، اور ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں موجود ہیں۔ ان اخباروں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ کے اوائل ہی سے بغاوت کے اثرات رونما ہونے لگے تھے اور اخباروں کا لب و لہجہ تند و تیز اور تلخ ہونے لگا تھا۔

"سلطان الاخبار" اپنے ایک شمارے میں لکھتا ہے:۔

---

[1] صادق الاخبار شمارہ ۲ اپریل ۱۸۵۶ء [2] عتیق احمد صدیقی "ہندوستانی اخبار نویسی" ۱۹۵۷ء ص ۲۶۳،۶۴۔

"ہمارا ملک اگر لیں گے جان دینے کا ارادہ کیا ہے۔ خلاف عہد و پیمان اگر ریاست لینے پر سرکار کو اصرار ہے تو یہاں بھی سر میدان ہر ایک جان دینے کو تیار ہے جس دم معرکۂ کارزار کی گرم بازاری ہوگی دیکھ لینا کیسی ذلت و خواری ہوگی"[1]

لکھنؤ سے ایک اخبار "سحر سامری" ۱۷ نومبر ۱۸۵۶ء کو جاری ہوا یہ اخبار اپنے ۱۵ دسمبر ۱۸۵۶ء کے شمارے میں اس دور کے حالات اور حکمرانوں کی بد انتظامیوں کا انکشاف کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"ان دنوں غلّہ کی گرانی ہے .... بے معنی نے ہر قماش کے آدمی کا اطمینان کھو دیا ...... ہر غریب و مسکین روٹی کے ٹکڑے کو محتاج ہوا ...... حاکم اس طرف عنان توجہ پھیرتا نہیں"[2]

امداد صابری کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق "کشف الاخبار" بمبئی سے منشی امان علی نکالتے تھے اس میں خبروں کے علاوہ مقامی واقعات پر تبصرہ بھی ہوتا تھا اور حکومت کے مختلف محکموں کی بد عنوانیوں کے خلاف آواز بھی اٹھاتا تھا[3]

"تاریخ بغاوت ہند" بھی اسی دور کا اخبار تھا جو ۱۸۵۹ء میں آگرہ سے جاری ہوا۔ اس میں سلسلہ وار ہندوستان کے مختلف علاقوں اور شہروں میں رونما ہونے والے جنگ آزادی کے واقعات شائع ہوتے تھے۔ "شعلۂ طور" بھی ایک اہم اخبار تھا۔ اس میں عام طور پر معاشرتی اور سیاسی واقعات کے بارے میں خبریں شائع ہوتی تھیں اور انقلاب پسندوں کے حالات درج ہوتے تھے جن میں انقلابیوں کے ساتھ زیادتی، ناانصافی اور ظلم و استبداد کو واضح طور پر بیان کیا جاتا تھا۔ غدر کے بعد خصوصاً مسلمانوں کو مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ چنانچہ ۲۸ جولائی ۱۸۷۲ء کے شمارے میں "شعلۂ طور" بہادر شاہ کے وزیر حکیم نواب ضیاء الدولہ کی داستانِ غم بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"حکیم صاحب پر بغاوت کا شک تھا کہ غدر میں شریک تھے اور بعد غدر کے اٹھارہ عزیز و قریب مثل بیٹیوں، پوتوں کے سرکار نے گرفتار کرکے گولیوں سے مار دیئے جو بیشمار دولت تھی وہ لٹ گئی۔ اور ان کا عمدہ محل سرکار میں ضبط ہوگیا۔ ان کی زندگی مصیبت میں گذرنے لگی۔ اور درحقیقت ان کا حال قابلِ رحم

---

[1] عتیق صدیقی "ہندوستانی اخبار نویسی" ۱۹۵۷ء ص ۲۶۳/۲۶۲۔ [2] "سحر سامری" شمارہ ۱۵ دسمبر ۱۸۵۶ء۔
[3] امداد صابری "تاریخ صحافتِ اردو" جلد اوّل ص ۲۰۳۔

تھا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں اور بیوی وغیرہ کو دو دو روز فاقے سے گذر
جاتے تھے جب سرکار نے اشتہار دیا کہ جو شخص چاہے دہلی میں آئے مگر پھر
گرفتار ہوئے ان کے مقدمے کی تحقیقات ہوئی لیکن عوام بیوت میں برے
ہوئے اور کچھ جائیداد مثل مکان اور دوکان کے واپس ملیں آٹھ مہینے
تک اس جائیداد پر قابض رہے بعد اس کے جب ایک جدید ڈپٹی کمشنر
آئے تو پھر مخبروں نے کہا، ہم نواب صاحب پر فرد جرم ثابت کر سکتے ہیں،
چنانچہ کمشنر نے گورنمنٹ میں رپورٹ کی اور جائیداد پھر ضبط ہوگئی اور نواب
صاحب پھر مفلس ہوگئے۔ سولہ سال تک متواتر انہوں نے سپریم کورٹ
میں عرضیاں گذاریں مگر کچھ سماعت نہ ہوئی اور نواب صاحب کسی زمانے
میں کروڑ پتی تھے فقیر سے بھی بدتر ہوگئے[1]۔"

غدر کے فرو ہونے کے بعد انگریزوں کی انتقامی کاروائی کا سلسلہ شروع ہوگیا جو برسوں تک
جاری رہا۔ اس پُر آشوب دور میں یعنی ۱۸۶۶ء میں رامپور سے "دبدبۂ سکندری" منظر عام پر آیا۔ یہ
اخبار نواب کلب علی خاں (رامپور) کی ایما، پر جاری کیا گیا تھا۔ اس اخبار میں اس دور کے ہنگاموں اور
سیاسی معاملات کا ذکر ملتا ہے۔ امداد صابری دبدبۂ سکندری کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اس (دبدبۂ سکندری) میں غیر ملکی خبریں زیادہ جگہ پاتی تھیں۔ انگریز حکومت کے
خلاف افغانستان میں جو بغاوتیں ہوتی رہیں اس اخبار میں ان کی تفصیلات
گاہے گاہے شائع ہوتی تھیں۔ یہ اخبار روس کی سیاسی حکمت عملیوں کا بھی
مخالف تھا اور وقتاً فوقتاً اس کے عزائم پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ ملکی مسائل
پر بعض اوقات مناسب موقعوں پر حکومت کی غلط کاروائیوں پر ٹوکتا تھا۔
اس کی اشاعت میں انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کا حال درج ہے[2]۔"

اس دور کے اخبارات میں ایک اخبار "آفتاب عالمتاب" شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کو مُراد علی نے
آگرہ سے ۱۸۶۱ء میں ہفتہ وار جاری کیا تھا۔ اس میں سیاسی خبروں کے علاوہ بہادر شاہ ظفر کے حالات
بھی درج ہوتے تھے۔

---

[1] شعلۂ طور شمارہ (۲) ۲ جولائی ۱۸۷۴ء۔ [2] امداد صابری "تاریخ صحافت اُردو" جلد دوم ص ۲۵۷۔

۱۸۷۱ء میں "اخبار عالم" لاہور سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ یہ اخبار حکومت کی بدانتظامیوں پر نکتہ چینی کرتا تھا اور حاکموں کے جانب دارانہ رویے کی نقاب کشائی کرتا تھا۔ "اتالیق ہند" کا ذکر بھی ضمنی طور پر کرنا ضروری ہے۔ "اتالیق ہند" ۱۸۷۲ء میں لاہور سے ہفتہ وار جاری ہوا تھا۔ یہ اخبار حکومت کو مشورے دیتا اور عوام میں ہندو مسلم اتحاد پیدا کرتا تھا۔

"تسنیم" آگرہ یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو جاری ہوا تھا اس اخبار کو منشی لال نکالتے تھے۔ تسنیم آگرہ میں اندرون ملک کے علاوہ غیر ممالک کی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ ہندوستانیوں کے سیاسی استحصال کے علاوہ انگریزوں نے ان کے سماجی و مذہبی معاملات میں دخل اندازی ہونا شروع کر دیا۔ انکے ذہنوں کو بدلنے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کئے گئے۔ مسیحیت کی تبلیغ زور شور سے شروع کر دی گئی۔ انگریزوں کی اس حکومت نے ہندوستانیوں کے دلوں میں عام طور پر نفرت اور غم و غصہ پیدا کر دیا۔ "تسنیم" آگرہ ۶ جنوری ۱۸۸۶ء کے شمارے میں ان کے افعال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "اب تو حد گزر گئی کہ ہر طرح کے افعال واسطے ور غلانے اور ناپاک کرنے کے پیدا کرتے جاتے ہیں۔ انجیل کی تقسیم اور منادی سے پیٹ نہ بھرا تو اسکول جاری کئے۔ اتوار سے انجیل کی پڑھائی روز مرہ کی گئی پھر بھجن سنائے گئے تب مستورات میں میم لوگ بھجن سنانے بحیلہ دست کاری جانے لگیں۔ پھر بازاروں اور میلوں میں جاکر کرسچین بھجن گانے لگے پھر باجا لیکر لوگوں کو متوجہ کیا اور وہ بھی کچھ تعجبات میں سے نہیں معلوم ہوا یعنی سوائے قحط زدوں کے بہت کم خوشی سے کرسچین ہوئے پھر گیروا کپڑے پہنے ...... اور مدرسوں سے جب کام خاطر خواہ نہ نکلا تو اب ہسپتال ہو گئے ہیں مردانہ بھی زنانہ بھی۔"[۱]

انیسویں صدی کے اواخر میں یعنی ۱۸۹۵ء میں امرتسر سے اخبار "وکیل" کا اجرا عمل میں آیا۔ اس کے مہتمم شیخ غلام محمد تھے۔ اس اخبار کی خدمات جن مدیروں نے یکے بعد دیگرے انجام دیں انکے نام اس طرح ہیں۔ مرزا جالب دہلوی، مولوی انشاء اللہ خاں انشاء، مولوی عبد اللہ منہاس، مولوی محمد شجاع اللہ حکیم فیروز الدین فیروز۔

اخبار "وکیل" کی زبان سلیس ہوتی تھی۔ اس میں عصری حالات و واقعات پر تبصرے شائع ہوتے

---

[۱] تسنیم آگرہ شمارہ ۶ جنوری ۱۸۸۶ء۔

تھے۔ ملکی اور غیر ملکی دونوں طرح کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر اخبار "وکیل" کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

"وکیل" اُردو صحافت کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس کے خیالات ہمیشہ دانشمندانہ اور پُر وقار رہے ہیں۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ذہنی رواداری کا مظہر تھی اور یہ وہ خوبی ہے جو اس دور کے بہترین انگریزی اخباروں میں بھی شاذ ہی ملتی ہے۔[1]

"وکیل" کو بیسویں صدی کے اوائل میں خاصی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالے "اُردوئے معلّٰی" کے ۱۱ مئی ۱۹۱۱ء کے شمارے میں اخبار وکیل پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"زبان کی صحت اور لٹریچر کی خوبی کے لحاظ سے زمیندار کی طرح وکیل بھی ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے ایڈیٹوریل مضامین کی آزادی کا مقابلہ نسبتاً کوئی دوسرا اسلامی اخبار نہیں کر سکتا۔ مثلاً ۱۹ اپریل کے پرچے میں مسلم یونیورسٹی اور عام رائے مطالبہ پر ایک قابلِ قدر مضمون لکھا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ قایم ہونے والی مسلم یونیورسٹی کو بہر صورت حکومت کی ماتحتی سے آزاد رہنا چاہیئے اُس کا چانسلر مسلمان ہو اور اس کی عنان حکومت مسلمانوں کے ہی ہاتھ میں رہے اور سب سے زیادہ اسکی تعلیمی زبان اُردو رکھی جائے۔"[2]

ان دنوں سرکار یہ غور کر رہی تھی کہ جو اخبارات باغیانہ مضامین لکھ رہے ہیں ان پر پابندی لگائی جائے اور افسرانِ بالا کو یہ اختیارات دے دیئے جائیں کہ وہ اس قسم کے اخباروں کو ڈاک خانے ہی میں روک لیں۔ ۲۱ جنوری ۱۸۹۰ء کے شمارے میں "وکیل" حکومت کی اس پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"سرکار چاہتی ہے کہ ڈاک خانے کے ذریعے معاندانہ مضامین کی اشاعت نہ ہو اس وجہ سے ڈاک خانے کے افسروں کو اختیار دے گی کہ جس تحریر

---

[1] کامریڈ شمارہ ۲۷ فروری ۱۹۳۰ء ص ۶ [2] اُردوئے معلّٰی شمارہ ۱۱ مئی ۱۹۱۱ء ص ۱۰۔

کو باغی بھیں بذریعہ ڈاک خانہ جانے سے روک دیں. سوال یہ ہے کہ فیصلہ کونسل کرے گی کہ کوئی تحریر باغیانہ ہے یا نہیں ؛ ڈاک خانے میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنے — ملک کے حقوق پامال کرکے اس کے خواہاں نہ ہوتے ہوں کہ سرکاران کے ساتھ رعایت کرے، کیا ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ملک کی آزادی چھوڑ دی جائیگی۔ جدید قانون ڈاک خانے میں جو اسوقت کونسل وائسرائے میں پیش ہے، علاوہ متذکرہ بالا دفعہ کے یہ بھی ایک دفعہ جدید بڑھائی جائے گی کہ جس وقت ملک میں کوئی عام شورش دیکھی جائے. اس وقت افسران ڈاک خانے کو اختیار حاصل ہونگے کہ وہ جس تحریر یا مطبوعہ کو چاہیں گے روک دیں گے اس امر کے فیصلے کے لئے کہ آیا اس کا وقت آگیا ہے یا نہیں کہ کاغذات کی اجازت رد کی جائے صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ سیکریٹری آف اسٹیٹ نے انڈیا آفس کی خواہش سے حکم دیا ہے کہ کوئی کاغذ کنیڈا سے ہندوستان کو ایسا نہ بھیجا جائے جس سے بغاوت ہو جائے [1]۔

اس دور کے اخباروں میں "کرزن گزٹ" ایک خاص اہمیت رکھتا ہے. کرزن گزٹ سنہ ۱۹۰ میں کلاں محل دہلی سے ہفتہ وار نکلنا شروع ہوا تھا. جو بیس صفحات پر مشتمل ہوتا تھا. اس کے مالک و مدیر مرزا حیرت ایک حق پسند اور بیباک صحافی تھے. حکومت کے کاسہ لیسوں پر نکتہ چینی کرتے نیز حکومت کی ناانصافیوں اور بداعمالیوں کی نقاب کشائی کرتے تھے. اس کے مدیر کو باغیانہ مضامین لکھنے کی پاداش میں بڑی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں لیکن ان کی روش میں کوئی فرق نہیں آیا۔

بیسویں صدی کے اوائل سے آزادیٔ ہند تک

بیسویں صدی کے اوائل میں نئی قومی تحریکوں نے جنم لیا۔ بنگال کی تقسیم، مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا کا قیام بھی اسی دور میں عمل میں آیا. دوسری دہائی میں انڈین نیشنل کانگریس میں کچھ گرمی کے آثار نظر

[1] اخبار "وکیل" شمارہ ۲۱ جنوری سنہ ۱۸۹۸ء۔

آنے لگے۔ پہلی جنگِ عظیم، ہوم رول لیگ، خلافت تحریک جیسی تحریکوں نے جنم لیا۔ ان تمام سیاسی سرگرمیوں کے اثرات اُردو صحافت نے بھی براہِ راست طور پر قبول کئے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں نکلنے والے اخباروں میں "وطن" اخبار کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اخبار ۱۹۰۴ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ تھے۔ ابتداً میں اخبار مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حقوق کے تحفظ سے بحث کرتا تھا البتہ ۱۹۰۷ء سے اس کی پالیسی میں تبدیلی پیدا ہوگئی اور اس میں تحریکِ آزادی کے سلسلے میں مضامین شائع ہونے لگے جو حکومت کے خلاف تھے۔ ۱۹۳۰ء میں "وطن" اخبار بند ہوگیا۔

"ترقی" ۱۹۰۲ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاسوں کی کاروائیاں چھپتی تھیں۔ جنوری ۱۹۰۸ء کے شمارے میں ایک اجلاس کی مختصر کاروائی شائع ہوئی، جو حسبِ ذیل ہیں:۔

> "انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس بھی اسی سال (۱۹۰۸ء) میں ہوا مگر امن وامان گذشتہ سالوں کی مانند خوبی کے ساتھ نہیں، کیونکہ اختلافِ رائے کے باعث اعتدال پسند اور انتہا پسند فریق میں خوب جھگڑا فساد ہوا۔ زیادتی انتہا پسندوں کی تھی۔ اس فریق کا پروگرام یہ ہے کہ حکمراں سے رعایت طلب نہ کرو، قانونی حدود سے باہر ایجی ٹیشن کرو، انگریزی چیزوں کو یکقلم چھوڑ دو، نہ گورنمنٹ کی ملازمت کرو، نہ سرکاری کونسلوں اور ڈسٹرکٹ میونسپل بورڈ کی ممبریاں، انگریزی عدالت سے انصاف نہ کراؤ، مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل نہ کراؤ"[1]

ماہنامہ "زمانہ" ۱۹۰۷ء میں کانپور سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر شیو برت لال تھے۔ اس میں سیاست، معاشیات، مذہبیات، اخلاقیات، طنزیات، نفسیات، لسانیات سے متعلق مضامین اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کا ایک کالم "رفتارِ زمانہ" کے عنوان سے شائع ہوتا تھا۔ اپنے دور کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے "زمانہ" جنوری ۱۹۰۷ء کے شمارے میں لکھتا ہے:۔

> "بغاوت کے بعد انگریزوں کو ہندوستانیوں سے ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔ انگریزوں کو بڑے سے بڑا جرم کرنے پر بھی کوئی خاص سزا نہ دی جاتی تھی اس کے برعکس

---

[1] "ترقی" شمارہ جنوری ۱۹۰۸ء

اگر کوئی ہندوستانی چھوٹا سا بھی جرم کرتا تو اسے سخت سے سخت سزا دی جاتی تھی۔"[1]

جنوری ۱۹۰۷ء ہی کے شمارے میں انگریزوں کی ناانصافیوں کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے :۔

"آج کل سرکاری تشدد کا زمانہ ہے گورنمنٹ اور قوم برطانیہ کو بغاوت کا بھوت ستا رہا ہے، اور سرکار اس سے مقابلہ کرنے کے لئے نئے قانون وضع کرنے پر تلی بیٹھی ہے۔ ہندوستانیوں کے لئے آہنی شکنجے تیار کئے جا رہے ہیں تاکہ ان کے ہاتھ پیر بندھنے کے علاوہ زبان بھی بند ہو جائے۔"[2]

معین عقیل بیسویں صدی کے اوائل کی صحافت کا مزاج اس دور کے سیاسی تناظر میں اس طرح بیان کرتے ہیں :۔

"بیسویں صدی کی صحافت کا لازمی مزاج سیاست تھا۔ مختلف سیاسی تحریکوں، ہلچل اور ہنگاموں میں اخبارات سیاسی ماحول کے تقاضوں سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ ہر اخبار کا اپنا سیاسی نقطۂ نظر ہوتا تھا۔ سیاست کی طرح صحافت بھی دو مختلف راہوں پر گامزن تھی۔ ایک متحدہ قومیت کے نظریئے کے ساتھ، اور دوسری علیحدہ مسلم قومیت کے تصور کے ساتھ، بعض اخبار اس ذیل میں زیادہ مستعد اور ہنگامہ خیز رہے ..... اخبارات نے اپنے دور کے سیاسی ماحول کو مثالی حد تک متاثر کیا۔ ان کا یہ انداز تقسیم ہند تک مستقل اور روز افزوں رہا۔ ایسے اخبارات میں "الہلال" اور "ہمدرد" دورِ اوّل ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔"[3]

زمیندار جون ۱۹۰۹ء میں لاہور سے مولانا سراج الدین نے جاری کیا تھا۔ ۱۹۰۹ء ہی میں مولانا سراج الدین کی وفات ہو گئی اور ان کے فرزند مولانا ظفر علی خاں نے اس کو جاری رکھا۔ زمیندار عوام میں بہت مقبول تھا۔ زمیندار کے انداز و اسلوب کے بارے میں خورشید عبدالسلام لکھتے ہیں

"اس دور کے سیاسی اداریے بلند آہنگ اور خطیبانہ انداز اور بیباکی طوفانی سیاست کی غماز ہیں۔ اس نے عوام کے دلوں میں غیر ملکی حکومت کا خوف دور کیا اور صداقت پر رہ کر اپنی بات کہنے کا درس دیا..... یہ اخبار ۱۹۳۷ء

---

[1] زمانہ کانپور، شمارہ جنوری ۱۹۰۷ء ص ۸۔ [2] زمانہ کانپور، شمارہ جنوری ۱۹۰۷ء ص ۹۔
[3] معین عقیل "تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ" ص ۶۶۹۔

تک قوم پرست اور کانگریسی نقطۂ نظر کا حامل رہا۔ اس کا خیال تھا کہ کانگریس ملک کی متحدہ قومی جماعت ہے اس کے زیرِ سایہ ملکی آزادی کے لئے جدوجہد ہو سکتی ہے، غرض کہ ہر اعتبار سے زمیندار کی حکمت عملی قوم پرستانہ اور کانگریسی تھی[۱]۔"

معین عقیل زمیندار کے بارے میں رقمطراز ہیں :۔

"زمیندار نے اپنے دورِ اجرا میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں نمایاں حصّہ لیا تھا۔ اوّلاً یہ سیاسی بیداری کسی واضح نصب العین کے لئے نہیں تھی لیکن اس سے آنیوالی سیاسی تحریکوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ اس میں طنزیہ اور سیاسی شاعری نے عروج پایا۔ اس کے ذریعے ہی مزاحیہ شذرات کی ابتدا ہوئی جس میں طنز و مزاح کے پیرایہ میں قومی اور ملکی مسائل کو نمایاں کیا جانے لگا۔ اس سے بڑے بڑے صحافی وابستہ رہے۔ ان میں عبداللہ العمادی، نصراللہ خاں عزیز، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، مرتضیٰ احمد خاں میکش، چراغ حسن حسرت، حاجی لق لق وغیرہ ممتاز ہیں[۲]۔"

"مخبرِ عالم" ۸ رجون ۱۹۰۳ء کو مراد آباد سے جاری ہوا۔ اس کا تیسرا شمارہ مخبرِ عالم اور رحمتِ عالم کے نام سے شائع ہوا۔ اس اخبار نے انگریزوں کی مسیحی تبلیغ کی سخت مخالفت کی۔ اخبار ۳۰ راگست ۱۹۰۳ء کے شمارے میں لکھتا ہے :۔

"ریاست جے پور میں جہاں بہت دنوں سے عیسائی پادریوں کے قدم جمے ہوئے ہیں ان کے دو مشن اسکول جاری ہیں۔ ایک عالیشان گرجا بنا ہوا ہے۔ عیسائی لیڈیاں گھر گھر تعلیم دیتی پھرتی ہیں۔ اور بڑی آزادی کے ساتھ عیسائی پادری وعظ کہتے ہیں۔ ..... ایک ریاست کے سب جج برہمن اور لیڈی ڈاکٹر برہمنی کو عام طور پر عیسائی بنایا گیا جس سے ہر طرف اس گروہ سے عام ناراضگی اور نفرت کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ ہندوؤں نے اپنے بچوں کو اسکولوں سے اٹھالیا مشینری لیڈیوں کا آنا جانا بند کر دیا ہے۔ عیسائی اسکول ویران پڑے ہیں[۳]۔"

---

[۱] خورشید عبدالسلام "صحافت پاکستان و ہند میں" ص ۴۳۹۔ [۲] تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ ص ۱۷۱۔
[۳] امداد صابری۔ تاریخ صحافت اردو جلد چہارم ص ۳۲۸۔

تحریکِ آزادی کے عظیم مجاہد، سیاست داں اور اعلیٰ پایے کے تخلیق کار، صحافی سید فضل الحسن حسرت موہانی کی ادارت میں رسالہ "اُردوئے معلیٰ" جولائی ۱۹۰۳ء سے نکلنا شروع ہوا۔ اڑتالیس سے چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس ادارہ میں اُردو کے نامور شعرار کے علاوہ ادبی، تاریخی تنقیدی اور سیاسی مضامین بھی بڑی بیباکی سے لکھے جاتے تھے۔ حکومت پر اعتراضات کرنا اور مسلمانوں کو کانگریس میں شمولیت کی تلقین کرنا اس کا شعار تھا۔ یہ اخبار کمیونسٹ پارٹی اور کانگریس کا حامی تھا۔ اور اس وقت وقوع پذیر ہونے والی تحریکوں میں حصہ لیتا تھا۔ "اُردوئے معلیٰ" کے فروری ۱۹۰۶ء کے شمارے میں ایک مضمون 'سدیشی تحریک' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ مضمون کا ایک اقتباس ذیل میں ملاحظہ ہو۔

> "سدیشی تحریک ایسی مفید اور مبارک تحریک ہے جس کے خلاف کوئی ہوش مند اور ایماندار آدمی اپنی آواز بلند نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے کہ ملک کے بعض دشمن بھی جو تمام ملکی تحریکوں کی مخالفت کرتے ہیں اس تحریک سے اعلانیہ طور پر اظہارِ اختلاف کرتے ہوئے جھجکتے ہیں" [1]

اس دور کے اخباروں میں "ہندوستانی" بھی قابلِ ذکر ہے۔ ہندوستانی ۲۶ راگست ۱۹۰۴ء کو لاہور سے ہفتہ وار جاری ہوا۔ یہ اخبار انگریزوں کا سخت مخالف تھا۔ جس دور میں ہندوستانیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور خاص کر افریقہ اور امریکہ میں ان کی بڑی تضحیک کی جاتی تھی "ہندوستانی" ان حالات کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

> "ہندوستانی تمام ممالک یورپ اور افریقہ سے کیوں نکالے جاتے ہیں اس لئے کہ وہ تھوڑی مزدوری پر کام کر دیتے ہیں، تھوڑے داموں پر گزر کر سکتے ہیں، جوتہ لات، گھونسہ اور گالیاں خوب کھا سکتے ہیں اور ہضم کر سکتے ہیں، غلاموں کی طرح فرمانبرداری کر سکتے ہیں جب دباؤ دب جاتے ہیں جو سنا وہ سن لیتے ہیں اور چوں نہیں کرتے۔ ہندوستانی تمام ملکوں سے رفتہ رفتہ کیوں نکالے جاتے ہیں اس لئے کہ وہ یورپین لوگوں سے ذہین محنتی اور ارزاں ہوتے ہیں۔" [2]

---

[1] اُردوئے معلیٰ شمارہ فروری ۱۹۰۶ء ص ۵۔ [2] بحوالہ امداد صابری 'تاریخ صحافت اردو' جلد چہارم ص ۴۸۲۔

"آزاد" جنوری ۱۹۰۶ء کو لاہور سے نکلنا شروع ہوا، اس کے مدیر لشن نرائن آزاد تھے۔ اس اخبار کا نصب العین ہندوستانیوں میں آزادی کی تبلیغ کرنا تھا۔ جس وقت انگریز ہندوستانیوں پر مظالم توڑ رہے تھے یہ اخبار بڑی آب وتاب کے ساتھ نکل رہا تھا۔ اور انگریزوں کے سفاکانہ مظالم کو دیکھ کر خاموش نہ رہ سکا۔ مارچ ۱۹۰۶ء کے شمارے میں ان خیالات کا اظہار ملتا ہے:۔

"ایک عرصہ سے ہندوستانیوں پر ظلم ہو رہا ہے اور سینکڑوں ہندوستانی گوروں نے ٹھوکروں سے اُڑا دیئے ہیں لیکن یہ خبر بھی کبھی سچ نہیں سمجھی جائیگی کسی کی تلی بڑھ جاتی ہے کوئی نمونیہ کا مریض ہوتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ مظلوم گوروں کی ٹھوکر کا مرض بتایا جائے۔ آخر اس ظلم کی انتہا بھی ہے گورنمنٹ کو یہ تبلا دینا چاہیئے کہ کتنے ہندوستانی جب تک گوروں کی ٹھوکروں سے نہ مریں اس وقت تک کوئی خبر سچ نہیں ہوگی یا دوسرے الفاظ میں یہ کہدینا چاہیئے کہ گوروں کو اتنے ہندوستانیوں کا خون معاف ہے۔ اگر گورنمنٹ ایسا کرے تو شاید ہندوستانی اس ظلم کو گوارا کریں کیونکہ وہ ایک زمانے سے ایسے ظلم کے برداشت کے عادی ہو رہے ہیں مگر سچائی کا حامی کہلاتے ہیں اور سچائی کا دم بھرتے ہیں گورنمنٹ کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ ہندوستانیوں کو اس دباؤ سے باز رکھے جو اپنے مظلوم حامیوں کے لئے کرتے ہیں اور ظلم کو پبلک میں لانے سے روکے جو ہندوستانیوں پر ہو رہے ہیں..... قید اور پھانسی ایسی سزائیں نہیں جو محبت بڑھائیں۔ گورنمنٹ کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جتنی سختیاں ہم پر کی جائیں گی اتنی ہی نفرت گوروں کے لئے ہمارے دل میں بڑھے گی۔ قومی شہیدوں کے خون کے ایک ایک قطرے سے ہزار ہزار جاں نثار پیدا ہوں گے...... قید ہمارے لئے فردوس سے کم نہیں، کیونکہ ہم قوم کے لئے صعوبتیں برداشت کرتے ہیں۔ قید کی تکلیفیں ہمارے لئے راحتیں ہیں۔ کاش وہ دن جلد آجائے جب ایک ہندوستانی بھی چوری اور بدمعاشی کے لئے جیل میں نہ جائیں۔ اگر جائے تو ملکی اور قومی محبت اور خیر خواہی کے لئے۔"[1]

---

[1] اخبار آزاد شمارہ مارچ ۱۹۰۶ء

"ہند" ۱۹۰۲ء میں لکھنؤ سے ہفتہ وار شائع ہوا، منشی دوار کا پرساد افق لکھنوی اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ اخبار سودیشی تحریک کا حامی تھا حکومت پر نکتہ چینی کرتا اور سخت مخالفت کرتا تھا۔ اس اخبار پر پابندی لگادی گئی اور یہ جلد بند ہو گیا۔

"انڈیا" گوجرانوالہ سے ۱۹۰۷ء میں جاری ہوا۔ حق پرست اور بیباک اخبار تھا۔ اس کے مدیر دینا ناتھ پر باغی ہونے کا الزام لگاکر پریس ضبط کرلیا گیا نیز مقدمات چلائے گئے کیونکہ اس میں انقلابی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اسی طرح "آفتاب" ۱۹۰۷ء میں ہفتہ وار نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر سید حیدر رضا دہلوی تھے۔ اس میں حب الوطنی سے بھرپور مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ اخبار ڈیڑھ سال کے بعد بند ہو گیا۔ "سوراجیہ" ۱۹۰۷ء میں الہ آباد سے شائع ہوا تھا۔ یہ حریت پسند اخبار تھا بغاوت کی تلقین کرتا تھا۔ اس کے مدیر کو جیل بھیجدیا گیا اور اس طرح یہ بھی ۱۹۱۰ء میں بند ہو گیا۔ ہفتہ وار "انقلاب" ۱۹۰۸ء میں معرض وجود میں آیا۔ یہ بھی سودیشی تحریک کی حمایت میں لکھتا تھا۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں بعض اہم اخبارات کا اجرا عمل میں آیا۔ اس زمانے کے صحافیوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ابوالکلام آزاد ایک ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک صاحبِ طرز ادیب، محقق اور سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب صحافی بھی تھے۔ اوائل عمر ہی سے مضمون نویسی میں شغف رکھتے تھے۔ اخبار بینی نے ان کے اس مذاق کو اور بھی جلا بخشی۔ اسی مذاق نے انہیں ایک کامیاب نثر نگار اور صحافی بنا دیا۔ اردو صحافت میں روز بروز ان کی دلچسپی بڑھتی گئی نتیجے کے طور پر مولانا نے ایک ادبی گلدستہ "نیرنگِ عالم" کلکتہ سے جاری کیا۔ "الصباح" اور "الندوہ" کی ادارت کے ساتھ "مخزن" اور مختلف جرائد اور اخباروں میں مضامین لکھتے رہے۔ مولانا نے "تحفہ محمدیہ" اور "خدنگ نظر" کو بھی مرتب کیا۔ ۱۹۰۳ء میں "لسان الصدق" جاری کیا۔ "وکیل" اور "دارالسلطنت" کی ایڈیٹری کے فرائض بھی انجام دیئے۔

صحافت میں مولانا ابوالکلام آزاد کا اہم ترین کارنامہ "الہلال" ہے۔ اس اخبار کا اجراء ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو عمل میں آیا۔ یہ ہفتہ روزہ اخبار اردو ٹائپ میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں مذہبی سیاسی، تاریخی، ادبی، سوانحی مضامین نیز جغرافیہ سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ ۱۶ر نومبر ۱۹۱۴ء

کو حکومت نے الہلال پریس کی دو ہزار روپے کی پہلی ضمانت ضبط کرلی۔ اس طرح ۱۴ اور ۱۷ ار اکتوبر کا مشترکہ شمارہ بھی ضبط کرلیا گیا اور دس ہزار روپے کی نئی ضمانت کا مطالبہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے ۱۸ ر نومبر کی اشاعت کے بعد "الھلال" بند ہوگیا۔ ۱۰ ر جون ۱۹۲۷ء کو الہلال دوبارہ جاری ہوا۔ اور ۹ ر دسمبر ۱۹۲۷ء کی اشاعت کے بعد الہلال بالکل بند ہوگیا۔

ہندوستان ہی میں نہیں جنوبی افریقہ میں بھی انگریزوں نے ہندوستانیوں پر ظلم توڑے اور ذلیل وخوار کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے۔ اور نئے نئے قانون نافذ کئے اسکے برخلاف جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں نے جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ شروع کر دیا۔ ہندوستانی بخوشی گرفتار ہوئے ادھر ہندوستان میں بھی ستیہ گرہ کی حمایت کی گئی۔ ہندوستانی اخباروں نے بھی اس تحریک کی حمایت کی۔

مولانا ابوالکلام آزاد ۶ ر نومبر ۱۹۱۳ء کے شمارے میں رقمطراز ہیں:۔

"میرا مقصد جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے تازہ مصائب ہیں۔ ہندوستانیوں کا کوئی جرم بجز اس کے نہیں کہ وہ وہاں بس گئے ہیں، کاروبار کرتے ہیں اور چونکہ محنتی اور کفایت شعار ہیں اس لئے روپیہ پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کی مرفہ الحالی وہاں کی گوری آبادی کو کھٹکتی ہے اور پسند نہیں کرتی کہ ان کی سرزمین میں باہر کا کوئی آدمی روپیہ کمائے۔ اور بوجہ کم خرچ اور کفایت شعار ہونے کے ہندوستانی کم نفع پر مال فروخت کرتے ہیں بعض بازاروں میں گورے دکانداروں کو اس سے بھی نقصان ہوتا ہے یہ ان کی مزید برہمی کا سبب ہے۔ انہوں نے اپنی گورنمنٹ کو آمادہ کیا ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہندوستانیوں کو یہاں کے قیام سے روک دیا جائے"[1]

امدادی صابری تاریخ صحافت اردو میں "الہلال" کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"مولانا کی ادارت میں الہلال نے ہندوستان کے عوام کو انگریزوں کی خلاف جدوجہد کی ہی دعوت نہیں دی تھی بلکہ انہیں یہ بھی بتایا کہ انگریز سامراج کے خلاف ان کی جدوجہد تمام آزاد پسند اقوام کی جدوجہد کا ایک جزو ہے۔ اس طرح الہلال نے ہندوستان کے مجاہدینِ آزادی کے ذہنی افق کو وسعت

---

[1] الہلال شمارہ نومبر ۱۹۱۳ء۔

بخشی اور ان کے عزائم اور ارادوں کو پختگی دی[1]۔

تحریکِ آزادیِ ہند کی تاریخ میں مولانا محمد علی جوہر کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ سچے مجاہدِ آزادی اور محبِ وطن تھے۔ تحریکِ آزادی کی تبلیغ کے لئے انہوں نے ایک اخبار "ہمدرد" کے نام سے جاری کیا۔ یہ اخبار ۲۳ر فروری ۱۹۱۳ء کو کوچہ چیلان دہلی سے ایک روزنامہ کی شکل میں جاری ہوا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر کی فرمائش پر مولانا حالی نے "ہمدرد" کے اجرار کے موقع پر ایک رباعی کہی تھی جس سے اس اخبار کی غرض و غایت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اک قوم کی خدمت کی ہے خواہش یا ربّ ۔۔۔ عزت کی تمنا نہ خطابوں کی طلب
اس نام کی لاج ترے ہاتھ ہے اب ۔۔۔ ہمدرد کو اسم با مسمّٰی کیجو!

ہمدرد کی فائلیں ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ میں موجود ہیں۔ ان فائلوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدار سے آخر تک مولانا محمد علی آزادیِ وطن کے لئے لکھتے رہے۔

۱۷ر دسمبر ۱۹۱۳ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:-

"آج کل مسلمانوں میں حریت اور آزادی کا بہت چرچا معلوم ہوتا ہے جو آوازیں پبلک میں سُنائی دیتی ہیں وہ حریت کے زور میں بہہ رہی ہوتی ہیں اور جو مضامین پبلک میں قبولیت حاصل کرنے کے واسطے لکھے جاتے ہیں ان میں سوائے آزادی کے اگر کوئی دوسرا خیال نظر آتا ہے تو وہ لوگوں پر لعن طعن ہوتا ہے جن کو یہ حریت پسند اپنا مخالف خیال کرتے ہیں۔ حریت اور آزادی بیشک انسانی زندگی کے واسطے روحِ رواں کا حکم رکھتی ہیں اور جس قوم میں حریت اور آزادی کا مادّہ باقی نہ رہے اس کے لئے موت زندگی سے بدرجہا بہتر ہے[2]۔"

الهلال کے بند ہوجانے کے بعد ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے ہفتہ وار البلاغ کلکتہ سے جاری کیا لیکن یہ بیک وقت دو شماروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ پندرہ روزہ نکلتا تھا۔ اپریل ۱۹۱۶ء کو صوبہ بدر ہوجانے کی وجہ سے ۱۷ر اور ۳۱ر مارچ ۱۹۱۶ء کے بعد البلاغ بند ہوگیا۔ البلاغ کی زبان بڑی صاف ستھری اور جامع ہوتی تھی۔ یہ اخبار بھی اپنے عہد کی سیاسی تحریکوں اور حالات و کوائف کا

---

[1] بحوالہ تاریخ صحافت اردو جلد پنجم ص: ۸۰

کا ترجمان تھا۔

مولانا محمد علی ہمیشہ کانگریس کے حامی رہے۔ انہوں نے ہندوستان کو تحریکِ آزادی میں شمولیت کی تلقین کی۔ ہمدرد کے ۱۴ اگست ۱۹۲۵ء کے شمارے میں لکھتے ہیں۔

"بعض روشن خیال سیاسیین کو سوراج پارٹی میں شامل ہونے میں تامل ہے اور ان کی رائے ہے کہ کانگریس میں اتنی وسعت نہیں کہ وہ اس میں داخل ہو کر سرگرمی کا اظہار کر سکیں۔[1]"

ایک اور جگہ کانگرس کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"کانگریس کی کامیابی نہ تو ممبروں کی تعداد پر منحصر ہے اور نہ مختصر جماعتوں کے اتحاد پر اس کا انحصار ہے بلکہ اس کا انحصار طاقت پر ہے جو وہ ہم میں پیدا کر دے۔ اس بات کا خیال دل میں لائیے کہ ہندوستان کی تمام جماعتیں اور بیس کروڑ کے بیس کروڑ انسان کانگریس میں باہم متحد ہو جائیں۔[2]"

اخبار "غدر" یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو کیلی فورنیا سے جاری ہوا۔ یہ اردو، ہندی، مراٹھی اور گورمکھی زبانوں میں نکلتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر رام چند اور معاون ایڈیٹر برکت اللہ بھوپالی تھے۔ یہ ایک انقلابی ہفتہ وار اخبار تھا جو ہندی ایسوسی ایشن آف پیگ کاسٹ کا آرگن تھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ ایسوسی ایشن سان فرانسسکو منتقل ہو گئی تو اخبار کا دفتر بھی منتقل ہو گیا۔ اس ایسوسی ایشن کا نام غدر پارٹی تھا۔ غدر پارٹی کے روحِ رواں اور اخبار غدر کے بانی لالہ ہر دیال تھے۔ یہ اخبار انگریزی حکومت کی شدت سے مخالفت کرتا تھا۔ عوام کو غدر پارٹی میں شامل ہونے اور تحریکوں میں حصہ لینے کی تلقین کرتا تھا۔ غدر پارٹی کے رضا کار اس کو عام سڑکوں اور بازاروں میں تقسیم کرتے نیز غیر ممالک میں رہنے والے ہندوستانیوں کو ہندوستان آنے کی تلقین کرتے۔ پہلی جنگِ عظیم کے ختم ہونے کے بعد جب انگریز ہندوستانیوں پر ظلم توڑ رہے تھے ایسے دور میں اخبار "غدر" لکھتا ہے۔

"غیر ممالک میں رہنے والے ہندوستانیوں تم فوراً ہندوستان آجاؤ اور غدر مچا کر انگریزوں کو قتل کرو اور ان کو اس قدر خوف زدہ کر دو کہ وہ بھاگ جائیں اور اس طرح ان کو ملک سے نکال کر ہندوستان کو برطانوی لعنت سے نجات

---

[1] ہمدرد شمارہ ۱۴ اگست ۱۹۲۵ء جلد دوم ص ۵۔ [2] ہمدرد ۲۴ دسمبر ۱۹۲۵ء جلد دوم ص ۵۔

دلاؤ۔ یہ صحیح اور ٹھیک وقت ہے غدر مچانے کے لئے اپنے آپ کو منظم کر کے
تیار ہو جاؤ ایسے میں جبکہ یورپ میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یہ تمام ٹیکس
دینا بند کرو، سارے ہندوستان میں غدر مچادو ہمیں ایسے بہادر اور سرفروش
مجاہدین چاہئیں جو ہندوستان میں غدر مچاسکیں۔[1]

اس دور کا ایک اور اہم اخبار "ہمدم" تھا۔ یہ اخبار یکم اکتوبر ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ سے جاری ہوا۔ ایڈیٹر سید جالب دہلوی تھے۔ اس اخبار نے ایسے دور میں تحریکِ آزادی کی حمایت میں آواز بلند کی جب ہندوستان میں پہلی جنگ عظیم جاری تھی۔ انگریزوں کی طرف سے سخت قانون نافذ کئے جارہے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر اخباروں کی ضمانتیں ضبط کرلی جاتی تھیں۔ اس اخبار کی فائلوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خلافت تحریک سے متعلق زیادہ خبریں شائع ہوتی تھیں۔ اخبار 'ہمدم' نے اپنی تحریروں کے ذریعے تحریکِ آزادی کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کی۔

پہلی جنگ عظیم سے قبل انگریزوں نے ہندوستانیوں سے جو وعدے کئے تھے پہلی جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ان کو پورا نہیں کیا۔ مزید یہ کہ ہندوستانیوں کے استحصال کے لئے "رولٹ ایکٹ" جیسے قوانین نافذ کئے۔ اس دور کے ایک اور اخبار "رہنما" نے "رولٹ ایکٹ" کی سخت مخالفت کی۔ یہ اخبار ۱۹۱۸ء میں محلہ منتی ٹولہ مرادآباد سے پندرہ روزہ نکلنا شروع ہوا۔ کچھ عرصہ بعد ہفتہ وار ہوگیا۔ اسکے مدیر محمد اشفاق حسین صدیقی مرادآبادی تھے۔ اس میں سیاسی مضامین ہوتے تھے بالخصوص پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کے مظالم کا ذکر اس کے مختلف شماروں میں مل جاتا ہے۔

اخبار "پرتاپ" ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو لاہور سے جاری ہوا۔ یہ روزنامہ چار صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ "پرتاپ" کے ایڈیٹر مہاشہ کرشن چندر تھے۔ جب "پرتاپ" معرض وجود میں آیا اس وقت پنجاب میں سیاسی بے چینی کا دور تھا۔ لہٰذا پرتاپ نے قومی نظریات کی حمایت کرنا شروع کردی۔ ۱۸ اپریل ۱۹۱۹ء کو مہاشہ کرشن چندر کو گرفتار کرلیا گیا۔ مہاشہ کی گرفتاری کے بعد پرتاپ بند ہوگیا ۱۹۲۰ء میں مہاشہ جی جیل سے واپس آئے تو "پرتاپ" بھی دوبارہ جاری ہوگیا۔

۱۹۱۹ء میں جب تحریک خلافت کا آغاز ہوا اسی سال لاہور سے اخبار "سیاست" کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ اخبار سیاسی تحریکوں کا حامی تھا اس کے باغیانہ رویّے کو دیکھتے ہوئے اخبار پر سنسر لگادیا

---

[1] بحوالہ تاریخ صحافت اردو جلد پنجم ص ۳۳۵۔

گیا۔ ایک غلط ترجمے کی سزا میں اس کے سب ایڈیٹر کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور اخبار کی ضمانت بھی ضبط کر لی گئی۔ ۱۹۲۱ء میں اس کے بانی و ایڈیٹر مولانا حبیب اللہ نے تحریک خلافت میں حصّہ لیا تو تحریک میں شمولیت کی پاداش میں انہیں بھی تین برس کی قیدِ با مشقت کی سزا دی گئی۔ اخبار "سیاست" کی تحریریں حق گوئی اور انصاف پسندی پر مبنی ہوتی تھیں۔ اسی لئے عوام اور خواص دونوں میں "سیاست" کو بہت مقبولیت ملی۔

۱۹۱۹ء میں اخبار "کانگریس" کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ اخبار کانگریس پارٹی کا ترجمان تھا۔ دہلی سے نکلتا تھا۔ اس کے مہتمم لالہ شنکر تھے۔ یہ اخبار قومی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ زیادہ دن نہ چل سکا اور جلد ہی بند ہو گیا۔

۱۲ اپریل ۱۹۲۳ء کو مہاشہ خوشحال چند کی زیرِ ادارت اخبار "ملاپ" کا اجرا ہوا۔ مہاشہ خوشحال چند نے ملک کی آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا، اور اپنی تحریروں کے ذریعے عوام میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا "ملاپ" میں انگریزوں کے خلاف کارٹون وغیرہ بھی شائع ہوتے تھے۔

روزنامہ "الجمعیۃ" گلی قاسم جان دہلی سے ۱۹۲۵ء میں جاری ہوا۔ اس اخبار کے مدیرِ اعلیٰ ابوالاعلیٰ مودودیؒ تھے۔ اس کے علاوہ جن صحافیوں نے بحیثیت ایڈیٹر اس اخبار کی خدمت انجام دیں ان کے نام بالترتیب اس طرح ہیں۔ مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا عثمان فارقلیط اور ہلال احمد زبیری وغیرہ۔ الجمعیۃ میں مذہبی اور سیاسی دونوں طرح کے مضامین ہوتے تھے۔ اس اخبار نے ملک کی سیاسی تحریکوں میں بھی حصّہ لیا۔ اس دور کا ایک اور اخبار ہفتہ وار "پیغام" پشاور سے ۱۹۳۰ء میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر سید میر عالم شاہ ایک بیباک اور نڈر صحافی تھے۔ انہوں نے انگریزوں کی سفاکانہ پالیسی کے خلاف قلم اٹھایا۔ اس اخبار کی پالیسی حکومت کے خلاف تھی۔ اس کی تحریریں بہت جذباتی ہوا کرتی تھیں اور ان میں انتہا پسندی پائی جاتی تھی۔ اس اخبار کی زندگی مختصر رہی۔ اس کے تین پرچے شائع ہوئے اور تینوں بحق سرکار ضبط کر لئے گئے نیز ایڈیٹر کو تین سال قید با مشقت کی سزا ملی۔

اس دور کے بعض اہم رسائل اور جرائد نے بھی آزادی کی تحریک میں حصّہ لیا۔ اگرچہ بعض رسائل بنیادی طور پر مذہبی اور ادبی تھے لیکن ملک کی سیاسی فضا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عوام کو ترجمان بن گئے اس دور کا ایک رسالہ "منادی" تھا۔ اس کے مدیر خواجہ حسن نظامی تھے۔ یہ رسالہ ۱۹۲۰ء میں کوچہ چیلان

سے جاری ہوا "منادی" تصوّف کی اساس پر جاری کیا گیا تھا لیکن اس کے ایڈیٹر نے تحریکِ آزادی کے واقعات، حالات، اور کوائف پر بھی لکھا۔ معین عقیل اس زمانے کے رسائل کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

"اس دور میں بعض اردو رسائل اور جرائد نے بھی سیاسی ماحول کے اثرات اخذ کر کے سیاسی رائے عامّہ کی ترجمانی کی۔ "ہمایوں" میاں بشیر نکالتے تھے۔ نیاز فتحپوری نے "نگار" کا اجراء کیا۔ حافظ محمد عالم نے "عالمگیر" نکالنا شروع کیا تھا حکیم یوسف حسن "نیرنگ" نکالتے تھے۔ "ادبی دنیا" شیخ عبدالقادر کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ شاہد احمد دہلوی نے "ساقی" کا اجرار کیا۔ "ادب لطیف" لاہور سے جاری ہوا۔ قدیم رسائل میں معارف اور جامعہ باقاعدگی سے نکلتے تھے۔ "ترجمان القرآن" مذہبی مقصد رکھتا تھا۔ لیکن اس نے سیاسی مباحث کو بھی اہمیت دی۔ اسے مولانا مودودی حیدر آباد دکن سے نکالتے تھے۔ یہ تمام رسائل اپنے عہد کے نمائندہ سمجھے تھے۔ ان میں ادب، فن، مذہب، تہذیب کے علاوہ سیاست پر بھی مضامین شائع ہوتے تھے[۱]"

عتیق صدیقی ہندوستانی اخبار نویسی کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:۔

"ہندوستانی اخبار نویسی کا اگر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستانی اخبار نویسی کا مزاج ابتدا ہی سے باغیانہ تھا۔ انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستانیوں نے فارسی، بنگلہ، اردو، ہندی اور انگریزی اخبار جاری کرنا شروع کئے۔ یہ سیدھے سادے معصوم سے اصلاحی اخبار ہوتے تھے۔ ان میں خبریں بھی شائع ہوتی تھیں مگر بظاہر غیر سیاسی قسم کی۔ ان کے انداز بیان اور مواد کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی گہرائی میں غم و غصے کے طوفان نظر آئیں گے[۲]"

مندرجہ بالا سطور کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں اخبارات ایک موثر ذریعۂ ابلاغ تھے جنہوں نے براہِ راست اور بالواسطہ طور پر عوام میں قومی شعور بیدار کیا۔ آزادی کی روح پھونکی اور عوام کو ملک گیر سطح پر بیدار کر کے اس تحریک کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

---

[۱] تحریکِ آزادی میں اردو کا حصّہ ص ۴۸۲۔ [۲] عتیق صدیقی ہندوستانی اخبار نویسی، ۱۹۵۷ ص ۵۹۔

اخبارات کے مدیر نڈر ہو کر بڑی بیباکی سے اپنے خیالات اور نظریات کو سپردِ قلم کرتے رہے۔ اس مجرم کی پاداش میں اخباروں کی ضمانتیں ضبط کی گئیں۔ مدیروں کو قیدِ بامشقت کی سزائیں دی گئیں۔ اخبارات پر سنسر لگا دیئے گئے اور پریس ایکٹ کے تحت سخت سے سخت قانون نافذ کئے گئے لیکن وہ اپنے ملک کی آزادی اور سلامتی کے لئے مسلسل جد و جہد کرتے رہے۔ ان اخبارات نے ہندوستانی عوام میں سیاسی بیداری پیدا کر کے حصولِ آزادی کی راہیں ہموار کر دیں۔

Dr. Zia ur Rehman Siddiqi is a young urdu Writer, Nationally known for his distinguished work in urdu research and criticism. He got his early education at Amroha (U.P.) and received higher education from Delhi University. He has been rendering yeoman's service to urdu since fifteen years. Jamia Millia Islamia New Delhi awarded him Ph.D degree in 1989.

Dr. Siddiqui has served in well reputed Universities such as Jamia Millia Islamia, Indira Gandhi National Open University, New Delhi and Punjab University, Chandigarh where he has taught Post Graduate Classes. He has been Post Doctoral Fellow of Indian Council of Historical Research New Delhi and also a UGC Fellow at Delhi University.

Presently, Dr. Siddiqui is a lecturer in Urdu Teaching and Research Centre, Govt. of India, Solan (H.P.). He is also a secretary of Anjuman Taraqqi e Urdu Hind branch Solan (H.P.)

Dr. Siddiqui is an eminent author and editor of numerous books and research papers published in India and abroad which include the following :

1. Hsuan-Tsang Ka Safar e Hundustan
2. Shehbaz Amrohvi - Fun Aur Shakhsiat
3. Maruzat
4. Iqbal Suhail Ka Fun
5. Tehrik e Azadi, Urdu Nasar Aur Muslim Udeba
6. Ahsan Danish - Intekhab e Kalam (In press)
7. 1857 Ke Akhbarat (In press)

(Publisher)